رام کُٹیا بک ڈپو سیریز ۱۲ Checked 1973 حقوق بحق مصنف محفوظ

اوم

کُنجِ عافیت

ایک نہایت ہی دلکش و سبق آموز مجلسی ناول

مصنفہ

فطرت نگار سدرشن صاحب

پبلشرز

رام کُٹیا بک ڈپو لاہور

مارچ سنہ ۱۹۲۶ء

دوسری دفعہ ۳۰۰۰ قیمت [illegible]

ادم

کُنجِ عافیت

(۱)

شام کا وقت تھا۔ میں جہاز کی چھت پر بیٹھا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھدیا اور شیریں لہجہ میں کہا۔ معاف کیجئے میں آپ کی تنہائی میں مخل ہُوا +

میں نے پیچھے مُڑکر دیکھا ——— یہ وہی تھا۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ میرے ساتھ مارسیلز ہی سے سوار ہُوا تھا۔ اُس کی شکل وصُورت اور عادات واطوار پر تمام مُسافر حیرت زدہ تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی خواہش تھی۔ کہ اُس کے ساتھ تعارف ہوجائے۔ مگر وہ سارے دن الگ پڑا رہتا تھا۔ میرے دل میں اُسے

دیکھتے ہی اُس کے لئے پُرسحر محبت پیدا ہو گئی تھی - میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس سے واقفیت ہو جائے - تو سارے سارے دن اُس کے پاس ہی بیٹھا رہوں - قیام انگلستان نے مغربی تہذیب کا خُوگر بنا دیا تھا - ورنہ ہندوستانی اِسقدر ظاہرداریوں کے کبھی پابند نہیں ہوئے - مگر وہ شخص بیحد تنہائی پسند اور کم گو طبیعت کا آدمی تھا - جہاز کے دیگر مُسافر ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے اور دن رات اکٹھے کھیلتے رہتے تھے - لیکن وہ ہمیشہ اپنے ہی کمرے میں پڑا رہتا تھا - وہ انگریز تھا - مگر اُس کی پوشاک ہندوستانی طرز کی تھی وہ اِس پوشاک میں دیوتا معلوم ہوتا تھا - ہندوستانی لباس میں نے لاکھوں آدمیوں کے جسم پر دیکھا ہے - مگر اُس انگریز کی سی خوبصورتی میں نے کسی اور آدمی میں نہیں دیکھی - میں خود فیشن پرست آدمی ہوں - پر اُس انگریز کی سادگی پر میرا دل فریفتہ ہو گیا - اُسے دیکھ کر مجھے قومی غرور کا احساس ہونے لگتا تھا - اور میں خوشی سے جھومنے لگ جاتا تھا - اکثر اپنے ہمراہی مُسافروں سے کہا کرتا - دیکھتے نہیں ہو - اُسے ہماری ہی چیز پسند ہے - مگر کیوں پسند ہے - یہ معمہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا - میں نے کئی دفعہ چاہا - کہ اُس سے بات چیت کروں - مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی - اِسوقت میں اِس نام نہاد تہذیب پر جُھنجھلا اُٹھتا تھا -

اُسے سامنے دیکھا - تو میرا دل شگفتہ ہو گیا - بے تکلفی کے انداز سے

بولا۔ "مطلقاً نہیں۔ مَیں خود اِس تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے"؟

اجنبی نے مُسکرا کر کہا۔ "آپ کس قدر مہربان ہیں"؟

"کیا مَیں آپ کو اپنے کمرے میں مدعو کر سکتا ہوں"؟

"بڑی خوشی سے"۔

مَیں اور وہ دونو کمرے میں گئے۔ اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اِسوقت مجھ پر ایک ایسے راز کا انکشاف ہُوا۔ جس کی مجھے مطلقاً توقع نہ تھی۔ مَیں نے پُوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گے"؟

"مُلتان"۔

"کیا آپ وہاں نوکر ہیں۔ کس محکمہ میں"؟

اجنبی نے جوابدیا۔ "وہاں میرا گھر ہے"۔

"آپ کا گھر"؟

"ہاں میرا گھر۔ کیا آپ کو تعجّب ہے"؟

"درحقیقت مَیں سمجھتا تھا۔ آپ پہلی دفعہ ہندوستان جا رہے ہیں"۔

"اور آپ کا خیال درست ہے۔ مَیں نے اِس سے پہلے ہندوستان کے ساحل پر کبھی پاؤں نہیں رکھّا"۔

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ جس طرح بادل چھا جانے سے رات کی تاریکی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چہرہ مجسّم سوال تھا۔

انگریز نے ہنس کر کہا۔ "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ انگریز"؟

میں نے جواب دیا "اور کوئی وجہ نہیں - کہ میں آپ کو کچھ اور سمجھوں"۔

"مگر آپ غلطی پر ہیں"۔

"تو ——"

"میں ہندوستانی ہوں"۔

میں اپنی جگہ سے اُچھل پڑا - جیسے کوئی اَن ہونی بات سُن لی ہو حیرت سے بولا "میں نے جگہ جگہ کا پانی پیا ہے - مجھے اپنے آپ پر بہت بھروسہ تھا - کم از کم قومیت کے بارے میں میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا - میں نے یورپ کے مختلف ممالک کے آدمیوں کی شناخت میں کبھی غلطی نہیں کی - مگر یہ خیال نہ تھا - کہ میں ایک ہندوستانی کو بھی نہ پہچان سکونگا - شرم نے چہرہ لال کر دیا۔

یکایک میں نے سر اُٹھایا "مگر آپنے کہا تھا - کہ آپ ہندوستان پہلی دفعہ جا رہے ہیں"۔

"واقعی"۔

"آپ ہندوستانی زبان جانتے ہیں؟"

"نہیں"۔

میری زبان بند ہو گئی - مگر میری آنکھوں سے حیرت مترشح تھی - تھوڑی دیر کے بعد میں نے پُوچھا "آپ ہندوستانی ہیں - مگر آپ کا رنگ ایسا سُرخ و سفید ہے - آپ ہندوستانی ہیں مگر

آپنے ہندوستان نہیں دیکھا۔آپ ہندوستانی ہیں مگر آپ ہندوستانی زبان نہیں جانتے۔آخر یہ کیا مُعمّہ ہے؟"

اجنبی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔اور کہا "اِسوقت نہ پوچھو۔ کِسی فُرصت کے وقت میں تم سے اپنی داستان کہونگا"۔

"نہیں۔ابھی کہو۔میرا دل بیتاب ہورہا ہے۔جب تک تمہاری کہانی نہ سُن لونگا۔مجھے چین نہ آئیگا"۔

اجنبی تذبذب میں پڑگیا۔شائد سوچ رہا تھا۔کہ کسی ناواقف کواتنی جلدی آپ بیتی سُنادینا واجب ہے کہ نہیں۔چہرے کا رنگ اِس کی شہادت تھا۔چند منٹ سکوت کا عالم طاری رہا اسوقت اُس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔اُس نے معذرت چاہی۔کہا۔کہ پھر کسی وقت کہونگا۔اِسوقت رہنے دو۔مگر میری مشرقی سرگرمیوں نے اُس کا مُنہ بند کردیا۔مجبُور ہوکر بولا۔تم پہلے شخص ہو۔جس کے سامنے مَیں یہ واقعات رکھنے لگا ہوں۔ ورنہ مَیں اِس سے پہلے کئی آدمیوں کو ٹال چکا ہوں۔ظاہرداری کے دو کلمے اُن کا جوش سرد کرتے رہے ہیں۔پر تمہارے اصرار کے سامنے انکار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔مَیں نے سُنا ہے۔تم ہندوستانی اخبارات میں اکثر مضامین لکھتے رہتے ہو۔ممکن ہے میرے واقعات تمہیں دلچسپ معلوم ہوں"۔

مَیں ہمہ تن گوش ہوکر سُننے لگا۔اجنبی نے کہا۔-

(۲)

اے بھائی! میرے آبا و اجداد مُلتان کے رہنے والے تھے۔ وہاں اُنکے نام کی ابتک پُوجا ہوتی ہے۔ وہ صرف متمول ہوں یہ بات نہ تھی۔ اُن کے دل جنس شرافت سے بھی مالامال تھے میرے بابا کے نام کی سارے مُلتان میں دھاک بندھی ہوئی تھی۔ وہ جب بازار میں نکلتے تھے۔ تو لوگ درشنوں کو ٹُوٹ پڑتے تھے۔ اُنکے فیصلے برادری میں ناطق تھے۔ اُن کی ہر بات پتھر کی لکیر تھی۔ ہماری برادری میں کسی کو اُنکے سامنے سر اُٹھانے کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں۔ جس دن وہ مرے تھے۔ اُس دن سارے شہر میں ہڑتال ہوئی تھی۔ اور اخبارات نے ماتمی نمبر شائع کئے تھے۔ اُن دنوں میرے والد صاحب انگلستان میں تھے۔ باپ کی وفات کی خبر سُن کر اُن کا دل رنجیدہ ہوگیا۔ کئی دن تک روتے رہے۔ اور مکان سے باہر نہ نکلے۔ وہ وہاں بیرسٹری کے لئے گئے تھے۔ میری ماں نے لکھا۔ اب واپس لوٹ آؤ۔ مگر اُنہوں نے جوابدیا۔ اب واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری والدہ دیہات کی رہنے والی تھی وہ پڑھنا لکھنا نہ جانتی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ انگلستان کہاں ہے اور وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے شوہر کا خط سُن کر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ مگر وہ رونے دھونے نہیں بیٹھ گئی۔ اُس نے زمینداری کا بوجھ اپنے گماشتہ کے

کندھوں پر رکھدیا اور آپ ولائیت پہنچ گئی۔ محبّت اُس کی راہنما بن گئی تھی۔ میرے باپ کو اُس کی وفاداری، محبّت اور اخلاص پر پُورا پُورا بھروسہ تھا۔ پر اُنہیں یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ اتنا فاصلہ تن تنہا طے کرسکتی ہے۔ مگر محبّت کیا نہیں کرسکتی۔ اُس نے اُنہیں ہندوستان چلنے کے لئے بہت کہا۔ مگر میرے والد کو انگلستان کی سرزمین کچھ ایسی پسند آگئی تھی۔ کہ وہ واپس جانے کو رضامند نہ ہوئے۔ آخر اُنہوں نے لورپول میں ایک دُکان کھول لی۔ اور کام کرنے لگے۔ چند ہی دنوں میں دُکان چمک گئی۔ روپیہ پانی کی طرح آنے لگا ممکن ہے۔ اگر آمدنی کی سبیل نہ نبتی۔ تو میرے والد ہندوستان کو واپس لوٹ جاتے۔ مگر دُکان کا چل نکلنا اُن کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ اُنہوں نے ہندوستان جانے کا ارادہ بالکل ترک کردیا۔ اور زمینداری کا کام اپنے گماشتہ پر چھوڑ دیا +

اے بھائیؑ! اِنہی دنوں میں مَیں پیدا ہُوا۔ میرے والدین کی خوشی کا ٹکانا نہ تھا۔ میرا نام ہری سین رکھا گیا۔ اور مجھے بڑے نازونعم سے پالا گیا۔ مَیں جب بڑا ہُوا۔ تو مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ مَیں اپنے آپ کو انگریز ہی سمجھتا تھا۔ اُسوقت میری ماں کا انتقال ہوچکا تھا۔ میرے باپ اور ہندوستان کے درمیان یہ ایک ہی کڑی تھی۔ وہ بھی ٹوٹ گئی۔ اب میرا باپ سولہوں آنے انگریز تھا۔ وہ مجھے ہری سین نہیں بلکہ ہیریسن Harrison.

کہکے بُلایا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو* H. capur. کہا کرتا تھا۔ ہندوستانیت پر انگریزیت غالب آگئی تھی۔ کاش میری والدہ زندہ رہتی۔ تو مجھے یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مَیں صرف غریب الوطن اور یتیم ہی نہ تھا۔ بلکہ قومیّت کے احساس سے بھی عاری تھا۔ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا۔ کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح عمرِ عزیز کے اٹھارہ سال گذر گئے۔ اور مَیں کالج میں داخل ہُوا۔ اُسوقت مجھے پہلی دفعہ معلوم ہُوا۔ کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ اے بھائی! مجھے معاف کرنا۔ مگر جھوٹ نہ بولونگا۔ مجھے اِس سے بیحد صدمہ ہُوا۔ ہندوستان کے متعلق میرے خیالات چنداں اچھے نہ تھے۔ مَیں اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہوگیا۔ اکثر سوچتا تھا۔ مَیں کیسا بدنصیب ہوں۔ کہ ہندوستانی والدین کی اولاد ہوں۔ سونے پر پیتل کا دھوکا ہورہا تھا۔ مَیں اپنی قومیّت کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا۔ اُسے چُھپا چُھپا کر رکھتا تھا۔ جیسے سفید کپڑے پر بدنما داغ لگ گیا ہو۔ اب اُن ایّام کو یاد کرتا ہوں۔ تو جسم کانپ جاتا ہے اور سر شرم سے اونچا نہیں اُٹھتا۔ لیکن اُسوقت یہ احساس نہ تھا۔ جب کبھی خیال آتا۔ کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ تو دل تڑپ جاتا تھا۔ جیسے کسی بدصُورت شخص کے سامنے آئینہ آجائے۔ تو وہ نادم ہو جاتا ہے —— مَیں اپنا نام ہیری سین کاپر ہی بتاتا تھا۔ دستخط کرتا تو لکھتا H. capur. میرے دوستوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ مَیں ہندوستانی ہوں

* ہری سین کپور کی بجائے ایچ کاپر

نہ مَیں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا میرے خیال میں ہندوستانی اور جرائم پیشہ ہم معنی الفاظ تھے۔ جب کبھی کوئی ہندوستانی جنٹلمین ہماری دُکان پر آجاتا۔ تو مَیں اُس کی طرف نہایت غور سے دیکھا کرتا تھا۔ اور سوچتا تھا۔ کہ اِس میں اور مجھ میں کون کونسی چیز مشترکہ ہے۔ رنگ۔ ڈھنگ۔ آنکھیں۔ چال۔ گفتار۔ رفتار سب الگ الگ تھے۔ مَیں اطمینان کا سانس لیتا تھا۔ جیسے کوئی مقدمّہ جیت کر خوش ہوتا ہے۔ مگر جب یہ خیال آتا۔ کہ کسی دن ممکن ہے۔ میری قومیّت عوام پر ظاہر ہو جائے۔ تو میرے دل پر بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔ اور مَیں تقدیر کو گالیاں دے ڈالتا تھا۔ آخر ایک دن وہی ہُوا۔ جس کا خطرہ تھا۔ میری قومیّت کالج کے دوسرے طلبا پر ظاہر ہو گئی۔ شام کا وقت تھا۔ مَیں اپنے ایک دوست کے ہاں چائے پینے گیا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "ہیلو! آج ایک نئی بات معلوم ہوئی"۔

مجھے کچھ کچھ شُبہ ہُوا۔ گھبرا کر بولا "کیا؟"

"مگر مجھے یقین نہیں آتا"۔

"تم پہلے وہ بات تو بتاؤ"۔

"غصّہ تو نہیں کرو گے؟"

"نہیں"۔

مگر دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔

اُس نے رُک رُک کر کہا۔ "تم مسٹر اِی کراس کو جانتے ہو؟"

"بڑی اچھّی طرح سے"۔

"وہ آج کلب میں کہہ رہا تھا۔ کہ تم ہندوستانی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

میری آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے میرے سامنے میری توہین کر دی ہے۔ اگر اُسوقت میرے ہاتھ میں پستول ہوتا۔ اور کراس سامنے آجاتا۔ تو مَیں اُسے وہیں ڈھیر کر دیتا۔ میں نے کس قدر کوششیں کی تھیں کیسی احتیاطیں کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا ——— میری قومیّت اب ایک کھلا ہُوا راز تھا۔

تاہم میں نے حوصلہ مندی کے انداز سے جواب دیا۔ "وہ راسکل جھوٹ بولتا ہے۔ اِس کا خمیازہ اُسے بُھگتنا پڑیگا"۔

کہنے کو تو یہ کہدیا۔ مگر طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ دوسرے دن کالج جاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ جیسے مجُھ سے کوئی گناہ سرزد ہو چکا ہو۔ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اور دُکان کا کام کرنے لگا۔ دوسرے سال میرے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔

(۳)

اے بھائی! میں نے دل کھول کر عیش کئے۔ روپیہ۔ حُسن اور جوانی۔ زندگی کی تین نعمتیں ہیں۔ مجُھے یہ تینوں میسّر تھیں۔ مَیں اپنی تعریف نہیں کرتا۔ مگر یہ امرِ واقعہ ہے۔ کہ مَیں عام انگریزوں کی

نسبت زیادہ خوبصورت ہوں۔ کم از کم لوگوں کا یہی خیال ہے۔ مجھ میں رنگ کی خصوصیت نہیں۔ ہر انگریز کا رنگ سفید ہے۔ مگر مجھ ایسے ہندوستانی نقش ونگار انگریزوں میں کہاں ہیں؟ اُنھوں نے کئی عورتوں کو تباہ کر دیا۔ مَیں اُن کے جذبات سے کھیلتا تھا اُن سے ہنستا تھا۔ مگر دائرہ تہذیب سے کبھی باہر نہیں ہُوا یہاں تک کہ ایک لڑکی سٹیلا نے اپنی پوری قوت سے مجھ پر حملہ کیا۔ یہ لڑکی انتہا درجہ کی خوبصورت تھی۔ اُس کی شکل شہزادیوں کی سی تھی۔ وہ عام انگریز لڑکیوں کے مانند اوچھی نہ تھی۔ نہ بات بات میں دانت کھول کر قہقہہ لگاتی تھی۔ وہ صرف مُسکراتی تھی۔ میرا قصرِ دل فتح ہوگیا۔

سٹیلا میری دُکان پر اکثر آنے جانے لگی۔ مَیں سب سے پہلے اُس کی طرف توجہ کرتا تھا۔ اور کوشش کرتا تھا۔ کہ اُسے زیادہ دیر تک رُکنا پڑے۔ مَیں اُس کی طرف اِس طرح دیکھتا تھا جس طرح بچہ تصویر کی طرف دیکھتا ہے یہ محبّت کے ابتدائی مدارج تھے۔ جو بہت جلد طے ہوگئے۔ اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے ملنے لگے۔ اب اگر وہ ایک دن بھی نہ آتی۔ تو مَیں بیتاب ہوجاتا تھا۔ جیسے شرابی شراب نہ ملنے سے بیتاب ہوجاتا ہے۔ مَیں اُس کے انتظار میں کئی کئی گھنٹے دروازے پر کھڑا رہتا تھا۔ اس عقیدت سے کسی عابد مرتاض نے اپنے معبُود کی بھی پرستش نہ کی

ہوگی اور یہ صرف میری ہی حالت نہ تھی۔ اُس کا بھی یہی حال تھا مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ آنکھوں میں چمک۔ اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ تمہارے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔ گھر جاتی ہوں تو کھوئی کھوئی رہتی ہوں۔ تم یہاں دُکان پر بیٹھے کام کرتے ہو۔ مگر میں گھر میں بیٹھی ٹھنڈے سانس بھرتی ہوں۔ میری حالت کا تصوّر کرنا ہو۔ تو مچھلی کو گرم ریت پر رکھ کر دیکھ لو۔ بالکل اسی طرح تڑپتی ہوں"۔

مَیں یہ سُنتا۔ تو سورگ میں پہنچ جاتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دُنیا کی برکتیں میرے ہی لئے بنی ہیں۔ اور مجھ سا خوش نصیب آدمی دُنیا بھر میں نہ ہوگا۔ اے بھائی! وہ جادو ٹوٹ چکا ہے۔ مگر اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ کہ سٹیلا سی حسینہ میں نے آجتک نہیں دیکھی۔ پریوں کے قصّے میں نے کتابوں میں پڑھے تھے۔ اُن کا راہزنِ صبر و شکیب حُسن تصویروں میں دیکھا تھا۔ اُنکی دلفریب ادائیں ناٹکوں میں مشاہدہ کی تھیں۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ اُن کا حقیقی وجود بھی ہے۔ سٹیلا نے اِس خیال کو رد کر دیا۔ اُس پر شہر کے بیسوں امیرزادے فریفتہ تھے۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ مَیں اِس خیال سے دیوانہ وار جھومنے لگ جاتا تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سٹیلا کرسمس کے لئے کپڑے اور زیور بنوا رہی

تھی - وہ اپنی ہر ایک چیز مجھے دکھاتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اِسکے بغیر وہ رہ نہ سکتی تھی۔ کم ازکم میرا یہی خیال ہے۔ میں نے سوچا۔ مجھے بھی کچھ تحفہ دینا چاہئیے۔ مگر کیا تحفہ ہو؟ مَیں تذبذب میں پڑ گیا۔ کئی دن تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے اک موتیوں کا ہار پسند کیا۔ یہ ہار اتنا خوبصورت اور خوش رنگ تھا۔ کہ مَیں زمین سے اُچھل پڑا۔ مگر قیمت سُنی تو دل بیٹھ گیا۔ ایک سو بیس پونڈ۔ مَیں نے اُسے ہاتھ سے رکھدیا۔ اور دوسرے ہار دیکھنے لگا۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی نگاہوں میں نہ جچا۔ آخر کفایت شعاری پر محبّت غالب آگئی۔ مَیں نے ہار خرید لیا۔ اور سٹیلا کی نذر کر دیا۔ اُسے دیکھ کر سٹیلا ادائے غرور سے جھُومنے لگی۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی "کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں"؟

"نہیں۔ اِس کی کوئی ضرورت نہیں"۔

"اچھّا۔ اِس کی قیمت کیا ہے؟"

"تمہاری نگاہِ محبّت"۔

"نہیں۔ سچ سچ کہو"۔

"اِسے کرسمس کے دن پہننا"۔

سٹیلا جوشِ محبّت سے بیقرار ہوکر مجھ سے چمٹ گئی۔ اِسوقت اُسکا پیار کیسا سچّا، کتنا حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ مجھ پر جادو سا ہو گیا۔ مَیں نے اسوقت تک اپنے آپ کو ضبط کیا تھا۔ مگر اسوقت دل بے قابو ہو گیا

میں نے سٹیلا کے دونو نازنین ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور محبت کے دفتر کھول دیئے۔ یہ میری قسمت کا امتحان تھا۔ مجھے کبھی تقریر کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ نہ مَیں سمجھتا ہوں۔ کہ مَیں تقریر کر سکتا ہوں۔ مگر اُسوقت میرے لفظ لفظ پر فصاحت قُربان ہو رہی تھی۔ یہ فصاحت سٹیلا کے دل میں بیٹھ گئی۔ مَیں نے اُسکے سامنے بیاہ کی تجویز رکھی۔ اُسنے زبان سے جواب نہ دیا۔ صرف مُسکرا کر میری طرف دیکھا اور گردن جُھکالی۔ میری خوشی کا ٹکانا نہ رہا۔ مَیں امتحان میں پاس ہو گیا تھا۔

کرسمس کا دن تھا۔ شام کا وقت۔ لوگ تحفوں سے لدے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اِسوقت اُن کے چہروں پر کیسی مُسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں کیسی خوشی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا آج دُنیا سے رنج وغم کا نام ونشان تک مٹ گیا ہے۔ مگر میرا دل اُداس تھا۔ سٹیلا ابھی تک نہ آئی تھی۔ مَیں مجسّم انتظار تھا۔ میری نگاہیں دروازے میں لوٹ رہی تھیں۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مَیں بار بار جُھنجھلا اُٹھتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اُسے میرا ذرا بھی خیال نہیں ورنہ ایسا انتظار نہ دکھاتی۔ ارادہ کیا۔ اب اُس سے بات نہ کرونگا۔ معاً کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ منتظر دل دھڑکنے لگا۔ نگاہیں دوڑ کر دروازے میں کھڑی ہوگئیں۔ دیکھا یہ وہی تھی۔ مگر کتنی اُداس اور افسُردہ دل۔ چہرہ یاس وحسرت کی زندہ تصویر تھا۔

میرا غُصّہ پانی پانی ہو گیا۔ محبّت اِس افسُردہ دلی کو دیکھ نہ سکتی

لوہے کے ہلکے ہلکے کیل دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔ اُسکی آنکھوں کے سیلاب رواں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیتاب ہوگیا۔ میں نے اُس کے قریب جاکر اُسے تسلّی دینے کی کوشش کی لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ عورت زیور کے نقصان کو شدّت سے محسوس کرتی ہے۔ مَیں جلدی جلدی بازار گیا۔ اور اُسی قسم کا ایک اور ہار خرید لایا۔ سٹیلا کے زخموں پر مرہم لگ گیا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو رُک گئے۔ میرے دل کو اطمینان ہُوا۔ جیسے ڈوبتی ہوئی کشتی کو کنارہ مِل جاتا ہے ؎

اِس کے بعد رستہ کھُل گیا۔ سٹیلا مجھ سے پے در پے فرمائشیں کرنے لگی۔ اوّل اوّل مجھے اس سے خوشی ہوئی۔ مَیں سمجھتا تھا۔ کہ یہ فرمائشیں کرکے سٹیلا مجھ پر احسان کررہی ہے۔ لیکن بعد میں اُس کے یہ احسان بار ہوگئے۔ ہم دن کو سمندر کی سیر کرتے۔ رات کو تھیٹر دیکھنے جاتے۔ دُکان کی طرف دھیان نہ رہا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہانتک پہنچی کہ بکری کم ہوگئی۔ مگر مَیں نے پھر بھی پروا نہ کی۔ اور اپنے مغربی مشاغل میں غرق رہا۔ یہاں تک کہ دُکان کا دیوالہ نکل گیا اور مَیں تباہ ہوگیا۔ اب مجھے سٹیلا کی نگاہیں کچھ کچھ بدلی ہوئی معلوم ہوئیں۔ مگر میں نے خیال کیا۔ کہ یہ میرا محض شبہ ہے۔ میں نے ریت کی دیوار کھڑی کی ؎

رات کا وقت تھا۔ مَیں اور سٹیلا ناٹک دیکھ رہے تھے۔ یکایک

تماشائیوں میں ہلچل مچ گئی۔ آرڈر آرڈر کی آوازیں سُنائی دیں۔
مگر کچھ اثر نہ ہُوا۔ تماشہ میں کچھ ہندوستانی طلباء آگئے تھے۔ اُن میں
اور انگریزوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اتنے میں کسی نے کہا
ہندوستانی سوٗروں کو مارو۔ مَیں نہیں جانتا۔ اُسوقت مجھے کیا ہو گیا
میں اُسوقت اپنے آپ میں نہ تھا۔ مجھ پر اک جنون سا سوار تھا۔
مَیں جوش کی حالت میں آگے بڑھا۔ اور اُس جگہ جا پہنچا۔ جہاں
انگریز ہجوم ہندوستانی طلباء کو زدوکوب کر رہا تھا۔ مَیں نہیں کہہ
سکتا میرے ہاتھوں میں کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ مَیں ہجوم کو
چیرتا ہُوا نکل گیا۔ اور ہندوستانیوں کی طرف سے لڑنے لگا۔
ہندوستانی طلباء پسپا ہو رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف سے لڑتے
دیکھ کر اُن کے اُکھڑتے ہوئے پاؤں جم گئے۔ اور وہ ڈٹ کر مقابلہ
کرنے لگے۔ مَیں اُن کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ کہ اتنے میں میرے
سر پر ایک ہنٹر پڑا اور مَیں بیہوش ہو کر گر پڑا ✦

جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا
مگر زخم معمولی تھا۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ اب مقدمہ پیش ہُوا
میرے بیان سے عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ کسے خیال ہو سکتا تھا۔
کہ میرے جیسا آدمی ہندوستانی ہو سکے گا۔ لوگ کانا پھُسکیاں کرنے
لگے۔ ہندوستانی طلباء میری طرف اِس طرح دیکھتے تھے۔ گویا مَیں اُنکا
معبُود ہوں۔ مگر مجھے اس پر حیرت نہ تھی۔ حیرت اِس بات پر تھی

کہ سٹیلا نے میرے حق میں شہادت دینا منظور نہ کیا۔ کیا تعجّب کا مقام نہ تھا۔ کہ جس عورت کی خاطر میں نے اپنا کاروبار تباہ کر دیا۔ اپنی مستقل آمدن برباد کر دی۔ جس کی خاطر میں نے اپنی زندگی اور اُس کے مستقبل کا خیال نہ کیا۔ وہ عورت میری خاطر دو کلمات خیر کہنے کو بھی تیار نہ ہوئی۔ ریت کی دیوار گر گئی —— اُسوقت وہ عدالت میں تھی اُس نے میری طرف دیکھا۔ مگر اِس طرح جیسے وہ آسمانی مخلوق ہو۔ اور میں زمین پر رینگنے والا حقیر کیڑا میں سنّاٹے میں آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں اسوقت غرور بیٹھا تھا۔ وہاں کبھی محبّت کھیلتی تھی +

مقدّمے کا فیصلہ ہُوا۔ تو لوگ حیران رہ گئے۔ مجھے دس دن کی سزائے قید کا حکم ہُوا۔ اخبارات میں شور مچ گیا۔ مگر مجھے پروا نہ تھی۔ رہا ہُوا۔ تو ہندوستانی طلبا نے میرا جلوس نکالا۔ اور مجھے ایڈریس دیا۔ ساتھ ہی ایک .Purse بھی پیش کی۔ اس ایڈریس سے میرا دماغ آسمان پر پہنچ گیا۔ سوچتا تھا۔ میں کیسا خوش نصیب ہوں۔ جو ہندوستانی ہوں۔ انگریز کئی سال بنا رہا۔ کسی نے پروا نہ کی۔ ہندوستانی ایک دن بنا۔ ایڈریس ملنے لگے۔ مگر مجھے سب سے زیادہ رنج سٹیلا کی بدسلوکی پر تھا۔ کیسی بیوفا عورت ہے۔ میں نے اُس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ وہ وقت پر آنکھیں چُرا لے گی۔ اُس دن میرے دل میں اپنی

قومیّت پر غرور کا احساس ہُوا۔ شام کو جب اخبار ڈیلی ہیرلڈ کا نامہ نگار مجھ سے انٹرویو کرنے آیا۔ تو مَیں نے بڑے فخر سے کہا۔ "ہاں! مَیں ہندوستانی ہوں۔ اور پرماتما کا شکر ہے۔ کہ مَیں کچھ اور نہیں ہوں"۔ نامہ نگار نے پوچھا "آپ کا انگریزی عدالتوں کے متعلّق کیا خیال ہے؟"

میں نے جواب دیا "اگر مَیں اپنی قومیّت کا اظہار نہ کرتا۔ تو میرا خیال ہے فیصلہ بالکل برعکس ہوتا۔ مگر جو خوشی مجھے اِس سزا سے ہوئی ہے۔ وہ رہائی سے کبھی نہ ہوتی۔ قصور سراسر ہجوم کا تھا ہندوستانی طلبا بالکل راستی پر تھے"۔

"آپنے اِس فساد میں کیوں حصّہ لیا؟"

"یہ بالکل قُدرتی تھا۔ مَیں رہ نہیں سکتا تھا"۔

"پر کیوں؟"

"میرا خون جوش مارنے لگا تھا"۔

"تو آپنے ہجوم پر حملہ کیا؟"

"جی نہیں۔ ہجوم نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور مَیں ہی زخمی ہُوا۔ ہر ایک شخص جو ہجوم میں شامل تھا میرے ساتھ اِس رائے میں متفق ہوگا کہ مجھے سزا دینا محض اپنی قومیّت کی طرفداری کرنا تھا"۔

اِس انٹرویو کا اخبارات میں مہینوں چرچا رہا +

(۵)

اے بھائی! میری دُکان کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ مگر مجھے بھُوکوں نہیں مَرنا پڑا۔ میرے احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ میں نے اُنکے سامنے روپے پیسے کا کبھی مُنہ نہ دیکھا تھا۔ میرے اِس مصیبت کے وقت وہ دریا دلیاں کام آرہی تھیں۔ جس دوست سے جو چاہتا تھا۔ مانگ لیتا تھا۔ کوئی انکار نہ کرتا تھا۔ اِسی طرح کچھ مہینے گزر گئے۔ تب یار دوستوں کی سرگرمیاں سرد مہریوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ اب وہ مجھے آتا دیکھتے۔ تو مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے میں بُلاتا تھا۔ تو اُنہیں آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ یہانتک کہ مجھے تین دن فاقے سے نکل گئے۔ جی چاہتا تھا۔ کسی سے کچھ مانگ لوں مگر غیرت ہاتھوں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا اب کسی سے کچھ نہ مانگوں گا۔ امارت لُٹ چکی تھی۔ اُس کی شان باقی تھی۔ میں نے ہندوستان بحری تار بھیجا تھا۔ اور اپنی اراضی کے گماشتہ سے روپیہ مانگا تھا۔ اِسوقت اُسی کے انتظار میں تھا +

دوپہر کا وقت تھا۔ مَیں اپنے کمرے کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا کہ آج کا دن کیسے کٹے گا۔ اتنے میں چٹھی رسان آتا دکھائی دیا۔ میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ خیال آیا۔ کیا ممکن ہے۔ کہ میرا کوئی منی آرڈر ہی آیا ہو۔ کوئی بیمہ ہو۔ کوئی رجسٹری۔ کوئی خط۔ اِس خیال سے طبیعت شگفتہ ہوگئی۔ جیسے بہار کے جھونکوں سے پھُولوں میں

تازگی آجاتی ہے۔مگر دوسرے خیال سے دل پر پھر مایوسی چھاگئی۔ جیسے پھول گرم لُو سے مرجھا جاتے ہیں۔مگر نہیں۔اُمید سامنے کھڑی تھی۔چٹھی رسان میرے پاس آکر رُکا۔اور ایک خط میرے ہاتھ میں دے کر آگے نکل گیا۔میں نے خط کھول کر پڑھا۔تو خوشی سے اُچھل پڑا۔یہ میرے مُلتان کے گماشتہ کا خط تھا۔جس نے مجھے اطلاع دی تھی۔کہ ایک ہفتہ ہُوا۔آپ کے حساب میں آٹھ سَو پونڈ ایسٹرن بنک کو بھیجدئے گئے ہیں میں اِس خبر سے ایسا خوش ہُوا گویا ڈربی کی لاٹری جیت لی ہے۔چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ پاس سے ایک آمنی بس گزر رہی تھی۔میں اچک کر اُس پر سوار ہوگیا۔اور بولا " ایسٹرن بنک کو لے چلو "

وہاں جاکر میں نے کچھ روپیہ نکلوایا۔اور ایک ہوٹل میں پُہنچا۔پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔اُسوقت مَیں کھانے پر اِس طرح ٹُوٹا۔جس طرح بھوکے بھیڑیئے برفانی علاقوں میں گھوڑوں پر ٹُوٹتے ہیں۔باہر نکلا۔تو آنکھوں میں پھر وہی غرور تھا۔چہرے پر پھر وہی بے فکری۔اتنے میں دیکھا۔سامنے سے سٹیلا آرہی ہے۔ اُس کی حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔نہ آنکھوں میں وہ چمک تھی۔نہ ہونٹوں پر وہ مُسکراہٹ۔رنگ موسم خزاں کے درختوں کی طرح زرد ہوگیا تھا۔کون کہہ سکتا تھا۔کہ یہ عورت کبھی لورپول بھر میں خوبصورت ترین عورت ہوگی۔میری آنکھوں میں

آنسو بھر آئے ہیں نے مغربی تکلّفات کو بالائے طاق رکھّا۔ اور آگے بڑھ کر کہا۔ "کیوں؟ تمہیں کیا ہُوا ہے؟"

سٹیلا نے اپنی آنکھیں میری طرف اُٹھائیں۔ مگر اُن میں وہ موہنی، وہ رونق، وہ دلکشی نہ تھی۔ تب ہم دونو کی نگاہیں ملیں۔ پر اُس پُرانی محبّت، آزادی، بے تکلّفی سے نہیں۔ ایک میں غرور بھرا ہُوا تھا۔ دوسری میں افلاس وندامت کے جذبات چھپے ہوئے تھے۔ سٹیلا کی زبان سے بات نہ نکلتی تھی۔ اُس نے صرف اتنا کہا خُدا کے لئے میری مدد کرو۔ اور رونے لگی۔

میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ افلاس سے زیادہ رنجدہ افلاس کا اظہار ہے۔ انسان افلاس سے نہیں ڈرتا۔ مگر اُس کے اظہار سے اُس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں نے چک بُک نکالی اور آٹھ پونڈ کا چک کاٹ کر سٹیلا کے ہاتھ میں دیدیا۔

شائد سٹیلا کو مجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ اُس نے میری طرف اِسطرح دیکھا جس طرح سہا ہُوا پُر تقصیر بچّہ اپنے محسن کی طرف دیکھتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ شدّت جذبات نے اظہار تشکریہ کی اجازت نہ دی۔ مَیں اپنے مکان پر پہنچا اور کوچ پر لیٹ کر سگار پینے لگا۔ کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا۔ کہ کمرے کا دروازہ کھُلا۔ اور بنک کا ایک آدمی سٹیلا کو ساتھ لئے ہوئے اندر آیا۔ اُسنے آتے ہی سٹیلا کا چک میرے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پُوچھا۔ "یہ چک درست ہے"۔

میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ چک میں آٹھ کے اسی پونڈ بنائے ہوئے تھے[۱]۔ اے بھائی! اگر میں چاہتا۔ تو اُسی وقت سٹیلا کو گرفتار کرا سکتا تھا۔ اُس کا جُرم روزِ روشن کی طرح عیاں تھا وہ سزا سے بچ نہ سکتی تھی۔ اُس کی بے وفائی میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی میرے دل میں مسرت خیز گدگدی ہونے لگی +

مگر پھر خیال آیا۔ آخر یہ عورت ہے۔ عورت کا دل کمزور ہوتا ہے ارادے پست۔ پتہ نہیں۔ کن وجوہ سے اُسنے میرے ساتھ بیوفائی کی۔ وہ اِسوقت انتہا درجہ کی تکلیف میں معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ورنہ ایسا جُرم کرنے کی کبھی جُرأت نہ کرتی۔ مَرے کو مارنا کہاں کی مردانگی ہے۔ مَیں نے اُس کی طرف استفسار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بھرے ہوئے پستول کے سامنے کھڑے ہوئے گھوڑے کے مانند کانپ رہی تھی۔ اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر نگاہوں نے جذبات کے دفتر کھولدیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہہ رہی ہے۔ میں نے تم سے دغا کیا سہی۔ مگر کبھی تمہاری تھی۔ کیا تم میری لاج نہ رکھو گے +

اِس نگاہ نے میرے ارادوں کو زیروزبر کر دیا۔ انتقام کا خیال اوچھا معلوم ہونے لگا۔ میں نے چک سے نگاہ اُٹھا کر

---

[۱] آٹھ کے ہندسے کے آگے صفر ڈالدینا نہایت آسان ہے۔ اِسی طرح Eight کا Eighty بنا لینا چنداں مشکل نہیں +

بنک کے آدمی کی طرف دیکھا۔ اور کہا ”ہاں یہ درست ہے“۔
”مگر ــــــــ“
”تمہاری احتیاط بجا ہے۔ میں نے پہلے آٹھ پونڈ لکھے تھے۔ بعد میں اسی بنا دئے۔ لاؤ دستخط کر دوں۔ مجھے افسوس ہے۔ اس غریب لیڈی کو اِسقدر زحمت اُٹھانا پڑی“۔
اور یہ کہتے کہتے میں نے جہاں جہاں بعد میں حروف کا اضافہ کیا گیا تھا۔ وہاں اپنے دستخط کر دئے۔

(۶)

دوسرے دن مجھے ایک ہندوستانی جنٹلمین ملنے آئے۔ ان کے ساتھ اُن کی بیوی بھی تھی۔ خاوند کا نام روپ چند تھا۔ بیوی کا دیوکی۔ دونو مہذب اور ملنسار تھے۔ اُن سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ دیوکی نہایت حسین تھی۔ اُس نے ہندوستانی وضع کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اِس لباس نے اُس کی خوبصورتی کو پر لگا دئے تھے۔ اُس کے جسم پر نہ زیور تھے۔ نہ چہرے پر پوڈر۔ مگر اُس کو دیکھ کر آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ وہ زمین کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں سادگی تھی۔ چہرے پر بھولا پن۔ باتیں کرتی تھی۔ تو مُنہ سے پھُول جھڑتے تھے۔ وہ سر نہ ہلاتی تھی۔ نہ آنکھیں مٹکاتی تھی۔ اِس کے باوجود اُس کی ایک ایک ادا میں جادُو تھا۔ مگر یہ شوخی و شرارت کا جادُو نہ تھا۔ نہ اس میں عُریانی و

تصنع کو دخل تھا۔ یہ وہ جادو تھا۔ جو شائد جادوئے حسن سے بھی زیادہ پُرزور، زیادہ پُراثر ہوتا ہے۔ یہ عصمت و پاکیزگی کا جادو تھا مجھے اُس دن پہلی دفعہ علم ہُوا کہ ہندوستانی حُسن کے مقابلہ میں مغربی حُسن کس قدر کم بضاعت و بےحقیقت ہے مگر اُس حُسن سے کہیں زیادہ وہ حیا تھی۔ جو مجھے دیوکی کے چہرے پر دکھائی دی۔ میری نگاہیں اُس کے پیروں میں لوٹنے لگیں۔ اُنہیں چہرے پر اُٹھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ چند گھنٹے میرے پاس ٹھہرے۔ مختلف مضامین پر گفتگو ہوتی رہی۔ تب مجھے معلوم ہُوا۔ کہ دیوکی اور روپ چند دونو بیحد ذہین وذکی ہیں۔ مینے جس مضمون پر بات چھیڑی اُنہوں نے میرا مُنہ بند کر دیا۔ مَیں ہر ہر دفعہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ اُسوقت خیال آیا۔ کیا یہی عورتیں ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ اُن کو کسی بھی بات کا سلیقہ نہیں۔ اگر اُن کو تعلیم نہیں دیجاتی۔ اگر اُن کی تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ تو کیا یہ اُن کا قصور ہے؟

وہ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ مَیں اُداس سا ہو گیا۔ مجھ پر کسی نے جادو نہیں کیا۔ سحر نہیں کیا۔ مگر میرا دل بس میں نہ تھا۔ میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا "میرا خیال ہے۔ آپ اب اکثر یہاں آتے رہینگے؟"

اس کے جواب میں روپ چند صرف مُسکرائے۔ اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر دیوکی نے آہستہ سے کہا "تمہیں ہندوستانی

بنانے کے لئے"۔

کیسی زبردست چوٹ تھی۔ کیسا لطیف مذاق۔ میرے دل میں جذبات کے طوفان برپا ہوگئے۔ سوچنے لگا۔ کیسی حماقت کی ۔ جو آجتک ہندوستانیوں سے متنفّر رہا ۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا۔ کہ وہ ایسے ہنس مُکھ ، ایسے مہذب ایسے ملنسار ہیں۔ تو اپنی قومیّت پر کیوں نادم ہوتا ۔ اِس چند گھنٹوں کی مُلاقات سے میرے خیالات میں انقلاب آگیا۔ میں نے ارادہ کیا۔ کہ اب سٹیلا کا خیال ترک کردونگا۔ اور روپ چند اور دیوکی کے ساتھ ہندوستان لوٹ جاؤنگا ۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہمارے باہمی تعلّقات بڑھنے لگے ۔ اب دیوکی اور روپ چند ہر روز شام کے وقت آتے اور ڈیڑھ دو گھنٹہ میرے پاس ٹھہرتے تھے ۔ اُن کی باتوں میں وقت گزرتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا تھا ۔ گھڑی کی سوئیاں ساکن ہوجائیں۔ مگر وقت کو کس نے پکڑا ہے ؟۔ جب وہ مجھ سے ہندوستانی گھروں کی اندرونی زندگی کا بیان کرتے تھے۔ تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ مَیں کہتا تھا۔ کیا کہانیاں سُنا رہے ہو۔ دیوکی مُسکرا کر جواب دیتی۔ تم مغرب میں پیدا ہوئے ہو۔ مغرب کی آب و ہوا میں پلے ہو۔ یہاں مادّیات کی حکومت ہے۔ تمہیں کیا معلوم ۔ کہ ہندوستان کی رُوحانیت کیسی بلند کیسی اعلےٰ ہے۔ وہاں ایک دفعہ جاکر دیکھو تو تمہاری آنکھیں کھُل جائیں۔ وہاں سے واپس نہ آسکو گے۔

تم نے مغرب کی عورتیں دیکھی ہیں۔جنہیں اپنے بناؤ سنگار ہی سے فُرصت نہیں ملتی۔ وہ اِسے ہی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں۔اِس سے پرے جانا اُن کے لئے سراسر بیوقوفی ہے۔ مگر ہندوستانی عورت محبّت کا دوسرا نام ہے۔ وہ اپنے شوہر کی اِس طرح پرستش کرتی ہے۔گویا وہ اُس کا پرماتما ہو۔ وہ اُس کی خاطر تن من دھن سب کچھ قُربان کر دیتی ہے۔ اگر دُنیا بھر کی بیاہی ہوئی عورتوں کو یکدم آزاد کر دیا جائے اور اُن سے کہا جائے۔ کہ اب پھر سے اپنے اپنے لئے شوہر انتخاب کرو۔ تو مجھے یقین ہے۔ صرف ہندوستانی عورت ہی ایسی نکلے گی۔ جو اپنے پہلے ہی خاوند کی طرف دوڑیگی۔ ہم میاں بیوی کے رشتہ کو مادری تعلّق نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے مُلک میں باوجود ہزارہا سال کی گراوٹ اور غلامی کے عصمت و نسوانی پاکیزگی کی ایسی بلند اور حیرت ناک مثالیں نظر آتی ہیں۔ کہ سیتا اور ساوتری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ؛

ان خیالات سے میرے دل میں وطن کی محبّت بیدار ہو گئی۔ سوچتا تھا۔ کیا سچ مچ ہندوستان ایسا مُلک ہے۔ بعض وقت طبیعت ایسی بیقرار ہوتی تھی۔ کہ میں چاہتا تھا۔ پَر ملیں۔ تو اُڑ کر ہندوستان پہنچ جاؤں۔ اور دیوکی کے دعاوی کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھوں ؛

دعوٰی

---

(۷)

اے بھائی! اِس واقعہ کو دو ہفتے گزر گئے۔ مَیں اُداس اور رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ اب لورپول کے بازاروں میں اور سمندر کے کنارے سَیر کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ذہن میں ہندوستان کا خیال سما چکا تھا۔ جس طرح سونا دیکھ کر پیتل کے ٹکڑے آدمی کے دل سے اُتر جاتے ہیں۔ اُسی طرح مجھے انگریزی تہذیب سے نفرت سی ہوگئی۔ سارے دن کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ مگر شام کو دیو کی اور روپ چند آتے۔ تو طبیعت بہل جاتی تھی۔ اُن کو دیکھ کر دل میں وطن کی عظمت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔

ایک دن سٹیلا کا خط آیا۔ لکھّا تھا:۔

مائی ڈیر ہیریسن!

تمہارے اُس دن کے حُسن سلوک نے مجھے موہ لیا ہے۔ مَیں سمجھ نہیں سکتی تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔ الفاظ میں یہ طاقت نہیں۔ میں نے سُن رکھّا تھا۔ کہ ہندوستانی دیوتا سرشت ہوتے ہیں۔ مگر اس پر اعتبار نہ آتا تھا۔ مَیں کہتی تھی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پر تم نے میرا خیال رد کر دیا۔ تمہاری محبّت میرے دل میں ایسی پُرزور کبھی نہ تھی۔ اب وہاں کسی دوسرے کے لئے جگہ نہیں مَیں اُس دن کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ جب ہم دونو ہندوستان جائیں۔ اور وہاں کی زمین۔ کھیتیاں۔ پہاڑیاں

دریا۔سبزہ۔آسمان دیکھ کر محظوظ ہوں۔اب میری صحت اچھّی ہے والدین کی موت کا غم ہلکا ہو رہا ہے۔کیا کسی روز تھیئٹر نہ چلو گے؟

ہمیشہ تمہاری سٹیلا

خط پڑھ کر پُرانی بیماری عود کر آئی۔جس طرح شرابی شراب خانے کے سامنے پہنچ کر اپنے قول و قرار بھُول جاتا ہے۔سٹیلا کا نازنین چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔مَیں بہت سوچتا تھا۔مگر سمجھ نہ سکتا تھا۔کہ سٹیلا نے چک میں جعلسازی کیوں کی؟ اِس خط کی آخری سطروں نے معمّہ حل کر دیا۔سٹیلا کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔اب وہ یتیم تھی۔بے یار و بے مددگار اُس کی شکل و صوت کیسی افسُردہ معلوم ہوتی تھی۔آنکھیں اندر کو گھُس گئی تھیں۔جیسے مہینوں کی مریض ہو۔میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ایسی حالت میں اُس کا جُرم جُرم نہیں رہتا۔آخر وہ کیا کرتی۔لیکن اگر مجھ سے تمام حالات بلاکم و کاست بیان کر دیتی۔تو یہانتک نوبت نہ پہنچتی۔گزرے ہوئے دن پھر واپس آگئے۔فضول خرچیوں کا دَور چلنے لگا۔اب پھر وہی سٹیلا تھی۔وہی مَیں تھا۔اور وہی نگاہیں تھیں۔

ایک دن میں نے کہا "سٹیلا! روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔کیا کرینگے؟"

سٹیلا نے میرے کوٹ کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا "کتنا روپیہ

باقی ہے۔ ذرا بنک کی کتاب دیکھو"۔

میں نے کتاب دیکھ کر جواب دیا "صرف سوا سو پونڈ باقی ہیں"

"ڈیر! ذرا فکر نہ کرو۔ میرا چچا سخت بیمار ہے۔ کوئی دن میں مرجائیگا وہ لاکھوں کا مالک ہے۔ اُسکی ساری جائداد مجھے ملے گی"

یاس میں اُمید کی کرن دکھائی دی۔ میں نے کرسی آگے سرکالی اور حریصانہ نگاہوں سے اُس کی طرف تاکتے ہوئے بولا "تمہیں اپنا عہد یاد ہے؟"

"اُسے دل کی گرہ سمجھو"۔

"روپیہ پاکر بدل تو نہ جاؤ گی؟"

"میں ایسی کم ظرف نہیں"۔

"روپیہ بُری چیز ہے۔ یہ اچھے اچھوں کو گمراہ کر دیتا ہے"۔

"پر تمہاری محبّت روپیہ سے کہیں بیش قیمت ہے۔ اُس کے سامنے دُنیا بھر کے سونے کی کوئی حقیقت نہیں"۔

اتنے میں ایک لڑکا لورپول ٹائمز کا تازہ پرچہ لے کر آیا۔ اور میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے اُسے اُٹھاتے ہوئے پوچھا "تو بُڈھا کب تک مر جائیگا؟"

"بہت جلد۔ شائد دو چار دن نکالے"۔

اتنے میں اخبار کے پہلے صفحہ پر میری نگاہ گئی۔ میں زمین سے اُچھل پڑا۔ کلیجہ لبوں تک آگیا تھا +

مسٹر کراس وُڈ کا انتقال

آخری الفاظ

ساری جائداد میری سٹیلا کے نام

جب اخبار پریس میں جا رہا تھا۔ تو ہمیں اطلاع موصول ہوئی۔ کہ لورپول کی مشہور دُکان پیپلز شاپ کے پروپرائٹر مسٹر کراس وُڈ کا انتقال ہوگیا ہے۔ ممدوح کچھ عرصہ سے بیمار تھے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ اتنی جلدی مرجائیں گے۔ مرحوم نے اپنی ساری جائداد اپنی یتیم بھتیجی میری سٹیلا کے نام لکھدی ہے۔ جو آجکل کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ مرحوم کی زبان پر آخری لمحوں میں اپنی بھتیجی کا نام تھا"۔

میں نے اخبار سٹیلا کے ہاتھ پر رکھدیا۔ اُسوقت میں ایسا خوش تھا۔ جیسے وہ جائداد مجھی کو ملی ہے۔ سٹیلا کی آنکھیں فرطِ مسرت سے چمکنے لگیں۔ چہرے پر مسکراہٹ کا رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اور اپنے لمبے قد کو اور بھی لمبا کر کے بولی میرا خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ اب ہم غریب نہیں ہیں"۔

یہ کہتے کہتے اُس نے میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے

دیکھا اور ٹوپی پہن کر باہر نکل گئی۔ شوق نے پاؤں میں پنکھ لگا دئے تھے۔ میں آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنے مستقبل کا نقشہ بنانے لگا۔ سوچتا تھا۔ جب سٹیلا کا مجھ سے بیاہ ہوگا۔ تو لوگ چونک اُٹھیں گے۔ اخبارات میں شور مچ جائیگا۔ کئی امیر زادے مُنہ کھولے کھڑے ہیں۔ سب کے سب مایُوس ہو جائیں گے۔ کہینگے۔ ایک ہندوستانی انگریزوں کو شکست دے گیا۔ میری باچھیں کھلی جاتی تھیں۔

شام کو روپ چند اور دیوکی آئے۔ تو میں نے یہ خوشخبری اُنہیں سُنائی۔ مگر اُنہوں نے اعتبار نہ کیا۔ بولے "تم سادہ لوح ہو۔ مغرب میں رہے ہو تو کیا ہُوا۔ تمہاری فِطرت تو نہیں تبدیل ہوگئی۔ سٹیلا جب غریب تھی۔ تمہاری تھی۔ اِس سے اُسے فائدہ تھا۔ مگر اب وہ امیر ہے اُس کے کئی امیر زادے ہم قوم اُس سے بیاہ کرنے کو تیار ہونگے۔ اب اُسے تمہاری کیا پروا ہے۔ دیکھ لینا۔ وہ صاف بدل جائیگی"۔

انسان جسے چاہتا ہے۔ جس پر اعتماد کرتا ہے۔ اُس کے خلاف نہیں سُن سکتا۔ مجھے اُن پر بیحد غصّہ آیا۔ روکھائی سے بولا "مجھے اُس سے یہ اُمید نہیں"۔

روپ چند سمجھ گئے۔ اسوقت کسی بات کا اثر نہ ہوگا۔ پاگل اور عاشق کو نصیحت ایسی بُری لگتی ہے۔ جیسی تیز کٹاری۔ بلکہ

اِس سے بھی بُری ۔ اُنہوں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا ۔ مگر آج مجھے اُن کی باتیں اچھی معلوم نہ ہوئیں ۔ کبھی اُنہیں سُن کر روح سرشار ہو جاتی تھی ۔ میں نے اخبار ہاتھ میں لے لیا ۔ اور اُسے دیکھنے لگا ۔ کسی کو ٹالنے کا یہ مہذبانہ طریق ہے ۔ رُوپ چند اور دیوکی اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ مَیں نے کہا "اتنی جلدی"؟

مگر دل دھڑک رہا تھا ۔ کہ کہیں بیٹھ نہ جائیں ۔

دیوکی نے جواب دیا "دل میں خوش ہو رہے ہو گے"۔

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ۔ مگر ہنس کر چُپ ہو رہا ۔ وہ دونو چلے گئے ۔ تو میں نے اطمینان کا سانس لیا ۔ مجھے امید تھی ۔ کہ سٹیلا آ رہی ہوگی ۔ مَیں آدھی رات تک دروازے میں کھڑا رہا ۔ مگر وہ نہ آئی ۔ تب خیال آیا ۔ آج دیر ہو گئی ہے ۔ کل آئیگی ۔ رات کو یہی خواب آتے رہے ۔ دن ہُوا ۔ اُمید نے پھر دروازے میں کھڑا کر دیا ۔ کوئی موٹر آتا ۔ تو شبہ ہوتا ہے ۔ وہی آ رہی ہے کوئی آواز سُنتا ۔ تو سمجھتا ۔ وہی ہوگی ۔ مگر وہ نہ آئی ۔ اِسی طرح سارا دن گزر گیا ۔ میرے پاؤں دُکھنے لگے ۔ مایُوس ہو کر اندر چلا گیا اور کرُسی پر گر پڑا ۔ مگر ابھی اُمید باقی تھی ۔ نگاہیں دروازے کی طرف جمی رہیں ۔ یہانتک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی ۔ اور ہوٹل کے مُلازم نے صدر دروازہ بلند کر لیا ۔ یہ گویا میری اُمید کا دروازہ تھا ۔ جو بند ہو گیا ۔ سوچنے لگا ۔ کیا وجہ ہے؟

جو وہ آج بھی نہیں آئی۔ اب مجھے اُس پر رہ رہ کر غصّہ آ رہا تھا۔ کہیں دولت پاکر مجھے بھول تو نہیں گئی۔ اگر یہی بات ہے تو مَیں اُس کا مُنہ بھی نہ دیکھوں گا۔ روپیہ پاکر مغرور ہو گئی ہے۔ مگر اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ مَیں بھی غریب نہ تھا۔ مَیں نے اپنی دولت اُسی پر قُربان کی ہے۔ سنبھال کر رکھتا۔ تو اُس جیسی سینکڑوں خرید سکتا تھا۔ پھر خیال آتا۔ نہیں۔ اُسے مجھ سے دراصل عشق ہے وکیلوں سے مشورہ کر رہی ہوگی۔ دُکان کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگی۔ وقت نہیں ملا۔ ورنہ بھاگی بھاگی چلی آتی؛

اِسی اُمید و بیم میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ مگر وہ نہ آئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ میری اُمیدوں کے شجر بے ثمر رہینگے۔ دل کو صبر کی تلقین کرنے لگا۔ جس طرح کوئی اپنے عزیز رشتہ دار کی مَوت پر دل کو سمجھاتا ہے۔ مگر اُس کا خیال بھولتا نہ تھا۔ مجھے وہ رہ رہ کر یاد آتی تھی۔ جس طرح مَرے ہوئے عزیز کا خیال بآسانی دل سے نہیں جاتا۔ اچانک ایک دن ایک آدمی نے آکر رقعہ دیا۔ لکھّا تھا؛

"اِسی وقت آؤ۔ دروازے میں کھڑی ہوں۔ سٹیلا"؛

(۸)

اے بھائی! مجھ پر کیفیت کی کیفیّت طاری ہو گئی۔ اُسوقت

مَیں زمین پر تھا۔ مگر میرے خیالات آسمان میں اُڑ رہے تھے۔ اُسی دم سٹیلا کے مکان پر پہنچا۔ وہ حسین تھی۔ اُسے میں نے سینکڑوں دفعہ دیکھا تھا۔ مگر اس امیرانہ لباس میں وہ پَری معلوم ہوتی تھی آج اُسکا حُسن پھٹا پڑتا تھا۔ وہ سچ مچ میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ آ گئی۔ میرے دل میں غُصّہ بھرا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جاتے ہی شکووں کا دفتر کھول دونگا۔ مگر اس مُسکراہٹ کی رَو میں غُصّہ اور شکوے اِس طرح بہ گئے۔ جس طرح دریا کے تیز دھارے میں کاغذ اور تِنکے بہ جاتے ہیں۔ میرے ہونٹ بند ہو گئے۔ مگر سٹیلا خاموش نہ رہی۔ میری طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "مجھے آپ سے بیحد گلہ ہے"۔

اب میری زبان کو بھی قوّتِ گویائی ملی۔ میں نے کہا "مجھے خاموش دیکھ کر آپ کو حوصلہ ہو گیا"۔

"آپنے میری بات تک نہ پوچھی۔ بڑے بے درد ہو"۔

"یہ مجھ سے نہ پوچھو اپنے دل سے پوچھو"۔

"مگر آپ آئے کیوں نہیں؟ کیا اتنا بھی خیال نہ تھا۔ کہ چل کر دیکھوں تو سہی۔ غریب پر کیا گزر رہی ہے"۔

"اب غریب ہم ہیں۔ آپ کی تو قسمت کھُل گئی"۔

"یہ طعنے بازیاں اچھی نہیں لگتیں"۔

مَیں نے سگار سلگا کر جواب دیا "اب جو کہو۔ سب سچ ہے"۔

"جی چاہتا تھا۔ زہر کھا کر مر جاؤں۔ ذرا خیال کرو۔ کتنا بڑا مکان ہے۔ اور کیسا آراستہ۔ مگر تمہارے بغیر قبرستان سے زیادہ خوفناک معلوم ہوتا تھا"۔

مَیں نے آگے بڑھ کر اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور ملائمت سے بولا "تُم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ دوڑتا ہُوا چلا آتا"۔

سٹیلا نے اپنی ٹھوڑی پر اُنگلی رکھکر جواب دیا "لو اور سُنو۔ مجھے تو سر کھجلانے کی بھی فرصت نہ تھی"۔

"اگر مجھے یہ معلوم ہوتا۔ تو ——"

"خیر اب جانے دو۔ تمہیں دیکھ کر سارا غُصّہ اُتر گیا"۔

مَیں نے چند منٹ توقف کیا۔ اور پھر سٹیلا کے چہرے کی طرف تاکتے ہوئے آہستہ سے کہا "سٹیلا! اب بیاہ میں توقف نہ ہونا چاہئے۔ اِس طرح چھُپ چھُپ کر ملنے سے دل کی پیاس نہیں بُجھتی"۔

سٹیلا کے گالوں پر حیا کی سُرخی دوڑ گئی۔ ہاتھوں کے دستانے اُتارتے ہوئے بولی "میرا خود یہی خیال ہے"۔

معاً باہر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ اور ساتھ ہی آواز آئی "اِس چھوٹے کمرے میں رکھدو"۔

سٹیلا کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ گر کر بیہوش ہو جائیگی۔ مجھے سکتہ سا

ہوگیا۔ جسم میں طاقت نہ رہی۔ سوچنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسوقت تک سٹپٹا بیٹھی تھی۔ یکایک کھڑی ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جس طرح بھولا ہُوا مسافر رستہ مِل جانے سے خوش ہوجاتا ہے۔ اُس نے اُنگلی سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اور میرے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دے کر کہا "اندر چھپ جاؤ۔ موقعہ پاکر پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر نکل جانا۔ مجھ سے اِسوقت کچھ نہ پوچھو۔ میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ مفصّل پھر کہونگی"۔

یہ کہتے کہتے اُس نے مجھے اندر دھکیل دیا۔ اور باہر سے تالا لگا دیا۔ مَیں ڈرے ہوئے بچّے کی طرح سہم گیا۔ زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ جس طرح سوئے ہوئے آدمی کو اُٹھاکر سمندر میں پھینک دیا جائے تو وہ بیدار ہونے پر اپنے آپ کو مَوت کی گرجتی ہوئی لہروں کے آغوش میں دیکھ کر سراسیمہ ہوجاتا ہے۔ اُسی طرح مَیں پریشان وششدر ہو رہا تھا۔ آناً فاناً یہ ہوجائیگا یہ امید نہ تھی۔ عشق کو پھُولوں کی سیج سمجھ کر آیا تھا۔ کاش پہلے سوچا ہوتا کہ اس میں کانٹے بھی ہونگے۔ پھُول دیکھ چُکا تھا۔ اب کانٹوں کی باری تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد جی گھبرانے لگا۔ جیسے یہاں برسوں سے بند ہوں۔ خواہش ہوئی دروازہ توڑ کر نکل جاؤں۔ باہر کوئی گاتا ہُوا جارہا تھا

اُس کی حالت پر رشک آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے ۔ جہاں چاہتا ہے جاتا ہے۔ پتہ نہیں کون ہے۔ مگر اُسے کوئی ڈر، کوئی خوف، کوئی اندیشہ نہیں۔ آزادی کی قدر آزادی کھو کر معلوم ہوئی۔ حالانکہ صرف گھنٹے دو گھنٹے کا سوال تھا۔ مَیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آزادی کے لمحے کا منتظر ہُوا۔ اتنے میں کسی نے کہا "مَیں واپس آ گئی۔ وکیل نے مجھے تار دیا تھا"۔

آواز کسی بُڑھیا کی معلوم ہوتی تھی۔

"سٹیلا نے جواب دیا "کوئی اہم بات ہوگی۔ ورنہ وہ تار ہرگز نہ دیتا"۔

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ میری واپسی سے تُم ناخوش تو نہیں ہوئی"۔

"تمہیں میری سعادتمندی پر شک ہے کیا؟"

"نہیں۔ یونہی پُوچھا تھا"۔

"ایسے سوال سُن کر مجھے آگ لگ جاتی ہے"۔

"توبہ! پھر نہ پوچھونگی۔ ذرا سامنے کے کمرے کی چابی دینا"۔

میرے بدن سے پسینہ چھُوٹنے لگا۔

"کیا کروگی؟"

میرا نائٹ گون اندر ہے"۔

سٹیلا نے جواب دیا "تم تھکی ہوئی ہو۔ آرام کرو۔ مَیں نکال

لاتی ہوں "۔

"نہیں۔ تکان کاہے کی۔ کونسا پیدل سفر کیا ہے؟ جو پاؤں نہیں اُٹھتے "۔

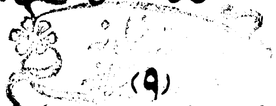
"پھر بھی بُڈھی ہو۔ زینے چڑھتے چڑھتے ہی دم پھُول جاتا ہے میں یہ نہیں دیکھ سکتی "۔

مگر بُڈھی نے نہ مانا۔ چابی لے کر دروازے کی طرف چلی۔ میرا دم رُکنے لگا۔ چاہا۔ کہ اُٹھ کر پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر نکل جاؤں مگر پاؤں نے جواب دیدیا۔ اُٹھنے کی ہمّت نہ رہی۔ بُڈھی دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ میں ایک کونے میں چھپا تھا مگر اُس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ ہونہار کو ٹالنے کی طاقت کس میں ہے۔ اُس نے زور سے چیخ ماری۔ اور چلاّ کر کہا "چور "۔

میرا خون جم گیا۔ حالات ایسی خوفناک شکل اختیار کرلینگے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ سٹیلا کو بچاؤ کا طریق سوجھ گیا۔ وہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔ اور زور سے چلاّنے لگی "چور۔ چور"

یہ سُن کر میں اس طرح چونک پڑا۔ جیسے آستین سے سانپ نکل آیا ہو۔ میں نے سٹیلا کی طوطے چشمی، بیوفائی۔ جعلسازی دیکھی تھی۔ مگر اُس سے یہ اُمید نہ تھی۔ کہ اپنی عزت کے مذبح پر میری بھینٹ چڑھاوے گی۔ میرے پاؤں من من کے بھاری ہوگئے بُت کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اتنا بھی نہ ہوسکا۔ کہ چابیوں کا

گچھا ہی پھینک دوں۔ اتنے میں پولیس کے ایک سپاہی نے آکر مجھے گرفتار کر لیا۔ میں دو گھنٹے کی اسیری سے گھبرا رہا تھا۔ اب کئی سالوں کی قید سامنے تھی۔ مگر مجھے پروا نہ تھی۔ انسان کی احسان فراموشی نے قید کی ذلّت اور شدّت کو کم کر دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہُوا۔ کہ وہ بُڑھیا سٹیلا کی موسی تھی اور سٹیلا کے چچا وصیّت میں لکھ گئے تھے۔ کہ سٹیلا کو اُس کی مرضی پر چلنا ہو گا۔ سٹیلا نے اُس کی ناراضگی کا خیال کیا۔ مگر میرا خیال نہ کیا۔



(۹)

اے بھائی! مجھ پر مقدّمہ چلا۔ اخبارات کو ایک مضمون مل گیا جلّی حروف کی سُرخیاں دے دے کر خبریں چھاپنے لگے۔ کوئی مجھے مہذب چور لکھتا تھا۔ کوئی ہندوستانی دیوالیہ۔ بعض اخبارات نے تو یہاں تک لکھ دیا۔ کہ میرا پیشہ ہی یہ ہے سٹیلا پر نامہ نگاروں نے یورش کی۔ اُس نے اپنی عزّت بچالی۔ مگر مجھے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کہا۔ کہ میں اِس انڈین سے بالکل ناواقف ہوں۔ میں نے اُسے اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ محض چوری کے ارادہ سے میرے مکان میں داخل ہُوا تھا۔ اُس کا اور مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ سُنا۔ تو پاؤں کے نیچے

سے زمین نکل گئی۔ سزا کا یقین ہوگیا۔ میں نے اپنے انگریز دوستوں کو رو رو کر لکھا۔ کہ میری امداد کرو۔ پر کسی نے جواب نہ دیا۔ لیکن روپ چند اس آڑے وقت میں کام آئے۔ اور مجھے ضمانت پر رہا کرا کے لے گئے۔ اِس کے بعد میں نے کئی دن تک اُنہیں آرام سے بیٹھے نہیں دیکھا۔ دن رات میرے مقدمہ کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے۔ اُن کے جوش انہماک کو دیکھ کر مجھے شُبہ ہونے لگتا تھا۔ کہ مقدمہ میرا نہیں اُن کا اپنا ہے۔ وہی شہادتیں بنا رہے تھے۔ وہی صفائی تیار کر رہے تھے۔ وہی کاغذات مرتب کرتے تھے وہی وکیلوں کے پاس جاتے تھے۔ اُن کی سرگرمیوں نے مجھے بے پروا بنا دیا۔ مَیں سارے دن دیوکی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ تب مجھے اُس کی رُوحانی عظمت کا احساس ہُوا۔ اُسے میں نے کبھی میری کوریلی رینالڈس۔ وکٹر ہیوگو یا الیگزینڈر ڈوما کے ناول پڑھتے نہیں دیکھا۔ وہ انہیں قطعاً پسند نہ کرتی تھی۔ وہ رامائن اور گیتا پڑھتی تھی۔ اِن کتابوں میں رینالڈس کے ناولوں کی سی پیچیدگیاں نہیں۔ نہ ڈوما کے سے نشیب و فراز ہیں۔ مگر ان میں انسانی زندگی کے ایسے پاکیزہ اور بلند معراج دکھائے گئے ہیں۔ کہ مَیں سُن کر اُچھل پڑا۔ مجھے لوگ کتابوں کا کیڑا کہتے ہیں۔ دن رات پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر رامائن سُن کر مجھے

ایسا معلوم ہُوا۔ کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ مغرب کے تمام لٹریچر کو اس اکیلی کتاب سے وہی نسبت ہے۔ جو ایک حقیر ذرّے کو آفتاب عالمتاب سے ہے۔ مَیں انگریزی کے تمام بہترین مصنّفوں کی بہترین کتب کو اِس تنہا کتاب پر قربان کر سکتا ہوں مجھے یہ اُمید نہ تھی۔ کہ ہندوستان میں ایسی کتابیں بھی ہیں۔ دیوکی کو سیتا کا کیریکٹر بہت اپیل کرتا تھا۔ اُس کا نام سُن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اور وہ صرف پڑھتی نہ تھی۔ جو کچھ پڑھتی تھی۔ اُسے اپنی زندگی میں جذب بھی کرتی تھی۔ وہ نہایت حلیم۔ شیریں مزاج۔ پاک دل۔ نیک فِطرت اور شریف عورت تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے ہندوستان پر غرور ہونے لگتا تھا۔ اُس نے مجھے کبھی گزشتہ افعال پر تنبیہ نہیں کی۔ کبھی میرے اغلاط کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اِس بات کو تہذیب سے گرا ہُوا سمجھتی تھی۔ مَیں اُس کے جتنا قریب ہوتا تھا۔ اُتنا ہی وہ مجھے زیادہ نیک، پاکیزہ معلوم ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا اُسکے قدموں سے لپٹ جاؤں ـــــــ وہ عورت نہیں دیوی تھی اُس کی مادرانہ شفقت پر میرا دل لوٹ پوٹ ہو گیا ٭

اے بھائی! مقدّمہ کا فیصلہ ہُوا۔ روپ چند کی کوششیں ثمرور ثابت ہوئیں۔ مَیں رہا ہو گیا۔ اور اتنا ہی نہیں سٹیلا پر اُلٹا مقدمہ چلا۔ اُس نے ایک شریف آدمی کی توہین کی تھی

اُسے پچیس۲۵ پونڈ جُرمانہ ہُوا۔ یہ پچیس پونڈ میری عزّت کی قیمت تھی۔ میں نے روپ چند کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ کوئی تعلّق نہ تھا۔ اُس نے صرف ہندوستانی ہونے کے باعث مجھ پر احسان کیا تھا۔ یہ رشتہ دوستی اور خُون کے رشتہ سے بھی مضبُوط ہے۔ یہ وطن کا رشتہ ہے +

میرے دل میں خاوند بیوی دونو کے لئے احترام نے جگہ لے لی۔ مَیں ایک کو دیوتا سمجھتا تھا۔ دوسرے کو دیوی۔ مَیں اپنے خانہ دل میں اُن کی پُوجا کرتا تھا۔ انسان اتنا بے غرض۔ اتنا شریف۔ اتنا نرم دل ہوسکتا ہے۔ اِس کی مجھے توقع نہ تھی۔ اُنہیں بازار میں جاتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کاگوں میں دو راج ہنس جارہے ہوں۔ میرے تعلّقات اُنکے ساتھ بڑھنے لگے۔ پہلے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ اب مَیں اُن کے ہاں جانے لگا۔ اگر ایک دن بھی نہ جاتا۔ تو طبیعت خراب ہوجاتی۔ جیسے کسی ضروری فرض کو ادا نہ کیا ہو۔ اور یہ صرف میرا ہی حال نہ تھا۔ وہ بھی مجھے گھر کا آدمی سمجھنے لگے تھے اور ہر امر میں مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن مَیں اور دیو کی سیر کو گئے۔ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ دیو کی بار بار آسمان کی طرف دیکھتی تھی۔ اُس کو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں بارش نہ ہونے لگے۔ مگر مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ ہم نے ایک کشتی کرایہ پر لی

اور سمندر کی سیر کرنے لگے۔ دیو کی اُس وقت بھی ہچکچا رہی تھی مگر اُس نے اپنا عندیہ مجھ پر صاف صاف ظاہر نہیں کیا۔ شائد اُس کو خوف تھا۔ کہ میں خفا نہ ہو جاؤں۔ کشتی سمندر کی لہروں پر ناچتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہم پانی کا تماشہ دیکھنے میں محو ہو گئے۔ اِس حالتِ استغراق میں کتنا وقت گزر گیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم ساحل سے بہت فاصلے پر آ گئے تھے۔ معاً بارش شروع ہو گئی۔ اِس بارش نے ہم پر وہی اثر کیا۔ جو پانی کے چھینٹے گہری نیند میں غافل سونے والوں پر اثر کرتے ہیں۔ ہم چونک پڑے کنارے کی طرف نگاہ گئی۔ تو کلیجہ سن سے ہو گیا۔ سوچنے لگے۔ اب کیا ہو گا۔ ہوا زور زور سے چل رہی تھی۔ اور ملّاح کی تمام کوشش سعیِ بے سُود ثابت ہو رہی تھی اُس کے کئے کچھ نبتا نظر نہ آتا تھا۔ سمندر کی خوفناک لہروں کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ مگر دیو کی کے چہرے پر شکن نہ تھا۔ وہ اسوقت بھی ایسی ہی خوش تھی۔ جیسے اپنے مکان میں بیٹھی ہو۔ مجھ سے بولی "اب گھبرانے سے کیا ہو گا۔ جو ہوتا ہے دیکھتے چلو۔ اور پرماتما پر بھروسہ رکھو"۔

میرے دل میں تیر سا چُبھ گیا۔ خیال آیا یہ عورت ہے مگر پھر بھی طوفان کے دھارے میں مطمئن بیٹھی ہے۔ میں مرد ہوں۔ مگر روح لرز رہی ہے۔ اس کی تہہ میں کیا بات کام کر رہی ہے۔

صرف یہ کہ اُسے پرماتما پر بھروسہ ہے۔ مجھے نہیں۔ اے بھائی اس پہلو میں مغرب پرماتما کی ہستی سے مُنکر ہے۔ مغرب کا باشندہ اپنے زورِ بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور بعض حالتوں میں پرماتما کو للکار بیٹھتا ہے۔ مگر اُس پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ اسے حماقت تصوّر کرتا ہے +

کشتی ہچکورے کھانے لگی۔ میرا دل بھی اِسی طرح ہچکورے کھا رہا تھا۔ دیوکی نے اپنے آپ کو پرماتما کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا مگر مجھ میں یہ طاقت نہ تھی۔ مَیں پانی کی طرف اور اُس کی مَوت سے بھی زیادہ خوفناک موجوں کی طرف دیکھتا تھا۔ اور کانپتا تھا۔ یکایک ایک لہر نے کشتی کو اُلٹ دیا +

(۱۰)

اے بھائی! اب ہم مَوت کے مُنہ میں تھے۔ مگر میں نے حوصلہ نہیں ہار دیا۔ مَیں سمندر کی دیوانی لہروں کے ساتھ کشمکش کرنے لگا۔ مجھے اتنا اپنا خیال نہ تھا۔ مَیں چاہتا تھا کسی طرح دیوکی بچ جائے۔ اُس کے اور اُس کے خاوند کے احسان میرے سامنے آگئے تھے۔ مَیں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر دیوکی کہیں دکھائی نہ دی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دُور دُور تک نگاہ دوڑائی۔ پر اُس کا پتہ نہ لگا۔ مَیں مایُوس ہوگیا۔ معاً کوئی چیز میری طرف آتی دکھائی دی۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ یہ

دیوکی تھی۔ مَیں اُس کی طرف بڑھا۔ اور اُسے ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پانی کو کاٹتا ہُوا کنارے کی طرف بڑھنے لگا۔

لیکن وہانتک پُہنچنا آسان نہ تھا۔ میرا دم پھُول گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ اتھاہ ساگر کی طرف دیکھ کر دل بیٹھ جاتا تھا۔ مگر دیوکی کا خیال ہمّت بندھائے جاتا تھا۔ موت اور زندگی پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ مَیں ہاتھ مارتا گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری کوششیں کبھی کامیاب نہ ہونگی۔ دفعتاً میں نے دیکھا۔ کنارہ قریب ہی ہے۔ مُردہ جسم میں جان آگئی۔ ٹُوٹا ہُوا حوصلہ بندھ گیا۔ میں نے اپنے جسم و رُوح کی انتہائی قوتیں صرف کر دیں۔ اور دیوکی کو لے کر کنارے پر چڑھ گیا۔

اے بھائی! ہم موت کے مُنہ سے بچ گئے تھے۔ مگر ابھی طوفان فرو نہ ہُوا تھا۔ مَیں پناہ کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ دیوکی کو ہاتھوں پر اُٹھائے ہوئے مَیں چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ ہاتھ تھک چکے تھے۔ پاؤں چلنے سے جواب دے چکے تھے۔ مگر مَیں پھر بھی چل رہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ آخر اک پُرانے وقتوں کا جھونپڑا مل گیا۔ اِس جھونپڑے کے درو دیوار خستہ ہو چکے تھے فرش جگہ جگہ سے اُکھڑا ہُوا تھا۔ مگر اِس طوفان بادو باراں کے موقعہ پر یہ جھونپڑا قصرِ شاہی سے کم نہ تھا۔ مَیں بے تحاشا اندر گھُس گیا۔ ایک طرف گھاس کے انبار لگے تھے۔ میں نے اُسے

زمین پر بچھا کر ایک گدگدا بستر تیار کیا۔ اور اُس پر دیو کی کے بے ہوش جسم کو لٹا دیا ٭

بارش ہو رہی تھی۔ مَیں جھونپڑے سے باہر نکلا۔ اور گرتے پڑتے ساتھ کے گاؤں میں پہنچا۔ یہاں سے کچھ دودھ خریدا۔ کچھ ڈبل روٹیاں۔ کوئلوں اور کمبلوں کے لئے روپے دے آیا۔ مزدوروں نے یہ سب سامان جھونپڑے میں پُہنچا دیا۔ اب یہ ایک دہقان کا گھر بن گیا تھا۔ میں نے چائے تیار کی اور دیو کی کو اُٹھا کر بٹھا دیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ جیسے بھی ہوسکے۔ روپ چند کے پاس پہنچ جائے۔ مگر بارش نے رستہ روک رکھا تھا۔ حتّٰے کہ تین دن گزر گئے اور تب جا کر بارش تھمی۔ میں نے گاؤں میں جا کر ایک گاڑی کا انتظام کیا اور دیو کی کو لے کر لورپول کی طرف روانہ ہُوا ٭

رستہ میں دیو کی بولی "وہ مجھ سے بیحد ناراض ہو رہے ہونگے"

"مگر اِس میں تمہارا قصور کیا ہے؟ اس غضب کے طوفان میں باہر نکلنا آسان نہ تھا"



"گھبرا رہے ہونگے"

"اب جلد پہنچ جاؤ گی"

"بغیر اجازت لئے نکل آئی تھی۔ آیندہ کے لئے کان ہوگئے"

اِس کا مَیں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دل میں سوچنے لگا۔ روپ چند کو کچھ شُبہ تو نہ ہو جائیگا۔ دیوکی تین دن میرے پاس رہی ہے اور اکیلی۔ شہر سے باہر ایک جھونپڑے میں۔ ایسی حالت میں شُبہات پیدا ہو جانا تعجب خیز نہیں۔ اگر روپ چند کے دل میں کوئی خیال جم گیا۔ تو دیوکی کی زندگی تباہ ہو جائیگی۔ وہ اِسے برداشت نہ کر سکے گی۔ مَیں تذبذب میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ جب وہ پوچھیں گے۔ کہاں رہی ہو۔ تو کیا کہو گی؟"

"جو کچھ امر واقعہ ہے۔"

مَیں چونک پڑا۔ مَیں اُس کے مُنہ سے یہ جواب سُننے کے لئے تیار نہ تھا۔ مَیں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کسی غیبی طاقت نے میری زبان پکڑ لی۔ شائد مجھے اپنی پاکیزگی پر۔ وہ اعتبار نہ تھا جو دیوکی کو اپنی پاکیزگی پر تھا میں نے آہستہ سے کہا "شائد یہ کہنا خلافِ مصلحت ثابت ہو۔"

دیوکی اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ جیسے کسی نے اُس کے کان کے پاس بندوق چلا دی ہو۔ اُس کا چہرہ تپے ہوئے لوہے کے مانند سُرخ ہو گیا۔ گھبرا کر بولی "کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ وہ مجھ پر شک کرنے لگیں گے؟"

"بدقسمتی سے حالات ایسے ہو گئے ہیں۔ کہ وہ شک کر سکتے ہیں۔"

"مگر مجھے یہ امید نہیں ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"تو صاف صاف کہدو"۔

"لیکن اگر اُنہوں نے اعتبار نہ کیا تو ——"۔

دیوکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاتھ ملتے ہوئے بولی "میں نے بُرا کیا ہے۔ میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا ہے۔ اِس کا انجام اچھّا نہ ہوگا"۔

میں نے چند منٹ تک غور کیا اور پھر کہا "مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ اجازت ہو تو عرض کروں"۔

"مَیں سمجھ گئی۔ کہئے"۔

"جھُوٹ بولنا ہوگا"۔

"جی چاہتا ہے۔ کچھ کھالوں۔ اُنکے سامنے آنکھیں نہ اُٹھینگی۔ اب تمہارے خیال میں مجھے کیا کہنا چاہئے"۔

"کہدیجئے۔ مَیں ذرا اپنی سہیلی کیتھرائن نانسی کے ہاں چلی گئی تھی۔ اتفاق سے طُوفان نے آگھیرا۔ تین دن تک وہیں پڑی رہی۔ بارش کے مارے باہر قدم رکھنا مشکل تھا۔ اب ذرا زور کم ہُوا ہے۔ تو آگئی ہوں"۔

دیوکی کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ تجویز سے متفق نہیں۔ وہ ہندوستان کی ہندو عورت تھی۔ جو اپنے خاوند کی پُوجا کرتی ہیں۔ اور اُسے پرماتما سمجھتی ہیں۔ اُس نے کبھی خاوند سے جھُوٹ نہ بولا تھا۔ وہ اِسے گناہ سمجھتی تھی۔ یہ اُس کی زندگی میں پہلا

موقعہ تھا۔ ضمیر نئے گھوڑے کے مانند سرکشی کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک یہ کشمکش رہی۔ اِس کے بعد مصلحت غالب آگئی۔ دیوکی نے میری تجویز منظور کر لی۔ اور اپنے مکان کے پاس پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئی میں اپنے ہوٹل کو چلا آیا ٭

(۱۱)

لے بھائی ارُوپ چند گھبرائے ہوئے تھے۔ دیوکی کو پاکر اُنہیں ایسی خوشی ہوئی۔ جیسے کسی کا ڈوبا ہُوا دھن مل جائے۔ اُنہیں دیوکی کے قول پر ذرا بھی شُبہ نہ ہُوا۔ اُنہیں یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ دیوکی اُن سے دغا کر سکتی ہے۔ اُس کی بات سُن کر اُنہوں نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ کامل طور پر مطمئن تھے۔ مگر دیوکی کا اطمینان اور قرار دونو رخصت ہوگئے۔ وہ ہر وقت اُداس رہنے لگی۔ سوچتی تھی۔ مَیں نے اُن سے کیوں جُھوٹ بولا۔ اُس کے الفاظ "مَیں اپنی سہیلی کیتھرائن نانسی کے ہاں تھی" ہر وقت اُس کے دماغ میں گناہ کی یاد کے مانند ڈنک مارتے رہتے تھے۔ وہ چاہتی تھی۔ کسی طرح یہ الفاظ واپس لیلوں۔ مگر آنکھ سے گرا ہُوا آنسو، اور قفس سے چھُٹا ہُوا پرندہ کہاں لوٹتا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی۔ جی چاہتا ہے۔ اُن کے پیروں سے لپٹ کر اپنے گُناہ کا اقبال کر لوں۔ اُن کا سینہ درد کا سوتا ہے مجھے فوراً معاف کر دینگے۔ مگر میں نے ہر بار اُس کے ارادہ کو

دبادیا۔ کہا۔ اب یہ غلطی مُہلک ہوگی۔ اُنہیں ضرور شُبہ ہوجائیگا۔ یہ شُبہ تمہاری خوشی اور زندہ دلی کو اس طرح نگل جائیگا۔ جس طرح طوفانی ندی کی گرجتی ہوئی لہریں سرسبز وشاداب کھیتوں کو نگل جاتی ہے۔ جِنّ چلاجاتا ہے۔ پر ظن نہیں جاتا۔ اب سوچتا ہوں۔ تو کہتا ہوں۔ مَیں نے اُسے یہ رائے کیوں دی۔ مگر غلطی کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوگیا۔ بسا اوقات ہماری بات چیت کے مابین روپ چند اندر آجاتے۔ مَیں اور دیو کی دونوا ناڑی تھے ہم نے جھوٹ بولا۔ مگر اُسے اختتام تک پہنچانے کے اہل نہ تھے۔ روپ چند کو دیکھ کر ہم اِس طرح خاموش ہو جاتے۔ جیسے چور اپنی چوری کو چھپاتا ہے۔ اسوقت دیوکی سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھتی اور آنکھیں نیچے جھکالیتی چہرے کے جذبات چھپانا آسان ہے۔ مگر نگاہیں چھپانا آسان نہیں۔ ان نگاہوں نے کام خراب کر دیا۔ روپ چند کو شُبہ ہونے لگا۔

مگر یہ شُبہ شُبہ ہی نہ رہا۔ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ ایک دن بازار میں کیتھرائن نانسی اور روپ چند سے مُلاقات ہوگئی۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک باتیں ہوتی رہیں۔ گھر آئے۔ تو ناگ کے مانند پھُنکاریں مار رہے تھے۔ اُسوقت اُن کے نتھنے پھُولے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلتے تھے۔ دیوکی کے رو برو

جا کر شرربار لہجہ میں بولے "دیوکی! مجھے تجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ مَیں تجھے دیوی سمجھتا تھا۔ اور تیری قسم کھاتا تھا۔ مَیں کہتا تھا۔ سب کچھ ہوسکتا ہے یہ نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ عورت پر اعتبار کرنا انتہا درجہ کی حماقت ہے۔ تو نے میری آنکھیں کھولدی ہیں" جس طرح زہریلے ناگ کے زہر کا اثر آن واحد میں مار گزیدہ کے خون میں سرایت کر جاتا ہے۔ اُسی طرح روپ چند کے ان الفاظ کا اثر دیوکی کے خون میں سرائیت کر گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ صوفہ سے اُٹھی مگر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ یہ غشی دیوکی کے گُناہ کا اقبال تھا

(۱۲)

اے بھائی! جب دیوکی کو ہوش آیا۔ تو روپ چند وہاں نہ تھے وہ میز کی طرف دوڑی۔ وہاں یہ رقعہ پڑا تھا:۔

دیوکی! تُو نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت پر اعتقاد تھا۔ مَیں اُس کی پُوجا کرتا تھا تُو نے میرا یہ خیال چھین لیا ہے۔ مجھے تجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ تُو تین دن غیر حاضر رہی۔ اور تُو نے مجھے کہا۔ کہ مَیں کیتھرائن نانسی کے ہاں تھی۔ مگر تیری نگاہوں نے تیرا راز آشکار کر دیا۔ مجھے شبہ ہونے لگا۔ مگر میں نے اُسے ظاہر نہیں کیا۔ مجھ میں یہ جُرأت، یہ دلیری نہ تھی۔ مَیں سمجھتا تھا یہ تُجھ پر، تیرے چالچلن پر ظلم کرنا ہے۔ مگر جب کیتھرائن نانسی نے کہا۔ کہ اُسے تجھ سے ملے مہینوں گزر گئے ہیں۔ تو میرا شبہ

یقین کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ جی چاہتا ہے۔ سمندر میں کُود کر جان دیدوں۔ زندگی میں کوئی دلکشی، کوئی رنگین نہیں رہی۔ اب زندہ رہنے سے کیا ہوگا؟..........

روپ چند

دیو کی نے ایک آہ ماری اور کوچ پر لیٹ گئی۔ اسوقت اُسکے دل میں ہزاروں خیال آرہے تھے۔ جس طرح برسات میں شام کو ننھے ننھے کیڑے اُڑنے لگتے ہیں۔ یہ کیڑے کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ کیسے پریشان کُن۔ اُنہیں دیکھ کر طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ وہ آدمی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ مگر اُس کا اُٹھنا بیٹھنا مُشکل کر دیتے ہیں۔ یہی حالت دیو کی کی تھی۔ وہ اُن خیالات سے گھبرا رہی تھی مگر مَیں کچھ ایسا مایوس نہ تھا۔ اخبارات میں اشتہار دئے۔ احباب کو تار بھیجے۔ دیو کی سارے سارے دن انتظار کرتی رہتی تھی۔ سوچتی۔ آج ضرور کچھ خبر آئیگی۔ دن نکلتا اور غروب ہو جاتا۔ مگر کوئی خبر نہ ملتی۔ دیو کی آہ سرد بھرتی۔ اور جاکر زمین پر لیٹ جاتی۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اُس کا کھانا پینا چھُوٹ گیا۔ پہننے کی سُدھ نہ رہی۔ اُسے دیکھ کر میرے جگر پر چھُریاں چل جاتی تھیں خیال آتا تھا۔ یہ سب میری ہی کرتوت ہے۔ اُس کا جسم مرجھا گیا تھا۔ صرف ہڈیوں کا پنجر باقی تھا۔ نہ چہرے پر رونق تھی۔ نہ آنکھوں میں دلکشی۔ مگر اُس کا جلال

بدستور قائم تھا۔ مجھے اُس کی طرف دیکھنے کی مجراُت نہ ہوتی تھی۔ سُنا تھا۔ ستی کی نگاہ میں آگ ہوتی ہے جو جس پر پڑتی ہے اُسے ہی جلاکر خاک سیاہ کردیتی ہے۔ مَیں اُس آگ سے اِس طرح ڈرتا تھا جس طرح ہرن کا بچّہ ہیکان تیر سے ڈرتا ہے۔ مَیں دیوکی کی خبر لینے ہرروز جاتا تھا۔ مگر سہما سہما رہتا تھا۔ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں اُس کی آنکھیں میری آنکھوں سے دوچار نہ ہو جائیں۔ اُس کی نفس کشیوں نے میرے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کردیا تھا۔ پہلے اُسے دیوی سمجھتا تھا۔ اب مہادیوی سمجھنے لگا۔ میں نے یورپ کی ہزارہا مہجور عورتوں کو دیکھا ہے۔ خاوند کی جُدائی میں اُن کے معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ وہ اُسی طرح ہنستی ہیں۔ اُسی طرح کھیلتی ہیں۔ اُن کے کھانے پینے میں۔ رہنے سہنے میں۔ بننے سنورنے میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی۔ مگر دیوکی کا خاوند کیا گیا۔ اُس کی دُنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ اُس کے بعد کسی نے اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کمرے میں بیش قیمت سامان تھا۔ اُسے اُٹھوادیا اور انتہا درجہ کے غریبوں کی طرح رہنے لگی۔ رام کی جُدائی میں جو حالت سیتا کی ہوگئی تھی۔ وہی حالت اب دیوکی کی تھی۔ وہ کتّھا مجھے خود دیوکی نے سُنائی تھی مگر اُسے یہ علم نہ تھا کہ اِس واقعہ کو عملی شکل میں بھی میرے سامنے اُسے ہی رکھنا ہوگا۔

اب میرے دل کی ایک ہی آرزو تھی۔ اور وہ یہ کہ جیسے بھی ہو

اپنی غلطی کی تلافی کروں۔ اور روپ چند کو ڈھونڈ کر دیو کی کے آغوش وفا میں سونپ دوں۔ سوچتا تھا۔ اُس دن خوشی سے دیوانہ ہو جاؤنگا۔ دُنیا میں لاکھوں خوشیاں ہیں۔ مگر دو بچھڑے ہوئے پاک دلوں کو ملا دینا سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ پاکیزہ منظر، یہ رُوحانی وصال دیکھ کر دل کو کون سنبھال سکتا ہے؟

جُوں جُوں دن گورتے گئے۔ یہ آرزو بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ راتوں کی نیند بھی حرام ہو گئی "تُو اپنے فرض سے کوتاہی کر رہا ہے"۔ یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ آواز کوئی وہمی آواز نہیں تھی یہ پرماتما کی آواز تھی۔ اِس نے مجھے میرا رستہ دکھا دیا۔ مَیں چند دن سوچتا رہا۔ آخر ارادہ عزم مصمم بن گیا۔ اور مَیں روپ چند کی تلاش میں روانہ ہُوا۔ مغرب کی مادہ پرست طبیعتیں مجھ پر آوازے کسیں گی۔ مگر مَیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ یہ تحریک خدائی تحریک تھی +

مَیں فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ گیا۔ وہاں کے تھیئٹروں، لیکچر گھروں اور پہاڑوں میں تلاش کیا۔ مگر روپ چند کا سُراغ نہ ملا۔ مؤخر الذکر مقام پر اُن کے مِل جانے کی مجھے بہت امید تھی مگر وہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ میرا دل مایُوس ہو گیا۔ جس طرح طالب علم بار بار فیل ہو کر مایُوس ہو جاتا ہے۔ میں نے دیو کی کو خطوط لکھے۔ اور اُن میں اپنی ناکامی کی ساری داستان بیان

کردی دیوکی نے اُن خطوط کا کوئی جواب نہ دیا۔ مگر بہت سا روپیہ بھیجدیا۔ تاکہ مَیں اپنی تلاش جاری رکھوں ؂

مَیں امریکہ پہنچا۔ یہاں رام کرشن مشن کی طرف سے کئی مندر کھڑے ہیں۔ وہاں ویدانت کا چرچا ہوتا ہے، گیان دھیان کے رموز بیان کئے جاتے ہیں۔ دن رات بھگتی کی گنگا بہتی ہے میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اُمید ہوئی۔ اب کامیابی دُور نہیں۔ روپ چند انہی مندروں میں سے کسی ایک میں ہونگے۔ انسان دُنیا لٹا بیٹھتا ہے۔ تو اُسے دھرم کا خیال آتا ہے۔ مَیں جگہ بہ جگہ گھُومنے لگا۔ جہاں جہاں ویدانت مندر تھے۔ سب جگہ پہنچا اور اُن کی تلاش کی۔ آخر معلوم ہُوا۔ کہ وہ کیلیفو رنیا میں ہیں۔ وہاں اُن کی پُوجا ہوتی ہے۔ مَیں اُڑتا ہُوا وہاں پہنچا۔ ویدانت مندر دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ مگر وہ وہاں بھی نہ تھے۔ چوکیدار سے پُوچھا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اُنھوں نے بستی سے باہر ایک جھونپڑا بنا رکھّا ہے۔ اِس جھونپڑے کا نام "گنجِ عافیت" ہے۔ اکثر اُسی میں رہتے ہیں۔ اور گیان دھیان میں محو رہتے ہیں۔ رات ہوگئی تھی۔ جب مَیں "گنجِ عافیت" میں پُہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی اُن کا پاکیزہ چہرہ نظر آیا۔ اسوقت وہ سنیاسی کے لباس میں تھے۔ مَیں نے اُنہیں قیمتی سے قیمتی لباس میں دیکھا تھا۔ اُسوقت وہ بارُعب راجکمار معلوم ہوتے

تھے مگر ان بھگوے کپڑوں میں وہ ایسے بارُعب، ایسے خوبصورت ایسے پاکیزہ دکھائی دینگے۔ یہ خیال نہ تھا۔ وہ اک چوکی پر بیٹھے تھے اور ویدانت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ اُن کے سامنے کیلیفورنیا کے بہترین اہل دماغ زانوئے ادب تہ کئے بیٹھے تھے۔ اور اُن کی واقفیت پر دم بخود تھے۔ مغرب۔ مشرق کے قدموں میں لوٹ رہا تھا +

یکایک اُن کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ تو چہرے کا رنگ زیادہ چمکنے لگا۔ جیسے بعض وقت بجلی کے لمپ میں روشنی زیادہ آجاتی ہے۔ مَیں آگے بڑھ کر اُن کے پاؤں میں گر پڑا۔ اِسوقت میرے دل میں دریائے عقیدت لہریں مار رہا تھا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہانتک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ اور مَیں دوسری شام کو ملنے کا وعدہ کرکے اپنے ہوٹل کو واپس ہُوا۔ مگر رات کو نیند نہ آئی۔ اُس کی جگہ خوشی نے لیلی تھی۔ صُبح کو اُٹھتے ہی میں نے دیوکی کو بحری تار دیدیا۔ اور اُسے روپ چند کے مِل جانے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد شہر کی سَیر کی۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور ذرا آرام کیا۔ یہانتک کہ شام ہوگئی۔ اور مَیں روپ چند کے "کُنجِ عافیت" کی طرف روانہ ہُوا۔ اِسوقت میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اشتیاق نے اُنہیں پَر لگادئے تھے۔ اُمنگوں کے آسمان پر اُڑا چلا جاتا تھا۔ مگر

منزلِ مقصود پر پہنچ کر دل بیٹھ گیا۔ وہاں پولیس کے آدمی جمع تھے۔ "کُنجِ عافیت" میں ہلچل کا طوفان مچا ہوا تھا۔ آگے بڑھ کر پوچھا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ رات کو ایک عورت کا خُون ہوگیا ہے۔ پولیس کو شُبہ ہے۔ کہ قاتل روپ چند ہے۔

(۱۳)

اے بھائی! یہ سُن کر میرا خُون منجمد ہوگیا۔ شادی والے مکان میں دولھا کی اچانک موت سے جو حال ہو سکتا ہے۔ وہی حالت میرے دل کی تھی۔ مجھے اِس پر یقین نہیں ہوتا تھا۔ لوگ کانوں کی نسبت آنکھوں پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ میں اگر یہ واردات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔ تب بھی یہی سمجھتا۔ کہ میری آنکھوں میں نقص ہے۔ میں سب کچھ مان سکتا تھا۔ مگر قتل کا فعل روپ چند کی ذات سے منسُوب نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لئے یہ ناممکن تھا پر اِس سے کیا ہوتا تھا۔ مقدمّہ کی سماعت شروع ہوئی۔ امریکہ بھر میں شور مچ گیا۔ روپ چند کو کیلفیورنیا گئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا۔ مگر اُس نے اپنی جادُو بیانیوں سے سارے شہر کو تسخیر کر لیا تھا۔ اخبارات میں اُسے پرہیزگار ہندوستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مشہور اخبار نیویارک ٹریبون میں اُسکی تقریریں شائع ہوئی تھیں۔ اور تعریفیہ کلمات کے ساتھ۔ لوگ اُسے رُوحانی پیشوا سمجھنے لگے تھے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کے

مانند آناً فاناً نزدیک و دُور پھیل گئی۔ میں نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ عدالت کی کارروائی دیکھ دل ڈھل جاتا تھا۔ اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ حالات بالکل صاف تھے۔ اُن میں کوئی پیچ نہ تھا۔ مقتول عورت کیلیفورنیا کے ایک مشہور تاجر کی بیٹی تھی۔ اُسے روپ چند سے عقیدت تھی اس عقیدت نے اُسے اُن کا بندہ بے دام بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اُنکے 'کُنجِ عافیت' میں جاتی رہتی تھی۔ اُس دن بھی حسب معمول گئی۔ مگر اُداس تھی۔ اُسی شام کو یہ قتل کا واقعہ ظہور میں آیا۔ روپ چند کا بیان تھا۔ کہ مَیں جھونپڑے سے باہر تھا۔ یکایک میں نے چیخ کی آواز سُنی۔ دوڑ کر اندر گیا۔ تو لوسی تڑپ رہی تھی۔ اور اُس کے سینہ میں چُھری آدھی سے زیادہ اُتر گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ چُھری اُس کے سینہ سے نکال لی۔ میرے کپڑے خُون سے تر ہو گئے۔ اتنے میں پولیس آ گئی۔ اور مجھے زیر حراست لے لیا گیا اس کے سوائے مجھے اور کچھ بھی علم نہیں۔

اے بھائی! مجھے روپ چند کے بیان پر پُورا پُورا اعتبار تھا میرے پاس اُن پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر عدالت کو قرائن سے معلوم ہُوا۔ اِس بیان پر یقین نہ آیا۔ مہینوں بحث ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ کا دن آ گیا۔ اُس دن عدالت میں تماشائیوں کا ہجوم تھا لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ امریکہ کی

بہترین ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے بھی کبھی اسقدر بیتابی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔ اخبارات کے رپورٹر کیمرے لے کر آئے تھے تاکہ فیصلہ کے عین بعد مُلزم کا فوٹو لے سکیں۔ مگر روپ چند کے چہرے پر کوئی فکر، کوئی ملال نہ تھا۔ وہ اِس طرح اطمینان سے کھڑے تھے۔ جیسے اُن کا مقدّمہ سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ مگر نگاہیں نہ مل سکیں۔ یہ سب میری کرتوت تھی ؛

یکایک جیوری نے فیصلہ سُنایا۔ لوگوں کے سانس رُک گئے۔ جیسے دم ہونٹوں تک آگیا ہو۔ چاروں طرف عالمگیر خاموشی چھاگئی ؛

"جُرم ثابت ہے۔ اِس لئے مُلزم کو سزا دی جاتی ہے۔ کہ اُسے گردن سے رسّا باندھ کر لٹکایا جائے۔ جبتک کہ اُس کا دم نہ نکل جائے "؛

میرے کلیجہ پر گویا کسی نے گرم سلاخ رکھدی۔ زمین پیروں تلے سے کھسکنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے درودیوار اُلٹ جانے کو ہیں۔ یکایک کوئی شخص بھیڑ کو چیرتا ہُوا آگے بڑھا۔ اور عدالت کے قریب پہنچ گیا۔ جس طرح ناٹک میں انتہا درجے کے پُراسرار واقعہ کے بعد اُس سے بھی پُراسرار واقعہ دیکھ کر آدمی سنّاٹے میں آجاتا ہے۔ اُسی طرح مَیں اِس آدمی کو دیکھ کر سنّاٹے

میں آ گیا ـــــــ یہ دیوکی تھی ۔

وہ جج کے پاس پہنچ گئی۔ اور آہستہ سے، مگر مستقل مزاجی کے لہجہ میں بولی "یہ بے گناہ ہے۔ قاتل میں ہوں"۔

عدالت میں شور مچ گیا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ سونا جب گرم ہوتا ہے تو پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔ یہ پانی سونے اور چاندی کا نہیں تھا۔ یہ پانی اِن دھاتوں سے زیادہ قیمتی، زیادہ پاکیزہ تھا۔ یہ جذبات کا پانی تھا۔ جیوری کے ممبر چونک کر کھڑے ہو گئے۔ سرکاری وکیل حیرت سے ہاتھ سر پر پھیرنے لگا۔ روپ چند سزائے موت کا حکم سُن کر نہ گھبرائے تھے مگر دیوکی کے ایک فقرے نے اُن کے ہونٹ خشک کر دئے۔ وہ اُس کی طرف اِس طرح دیکھنے لگے۔ گویا پاگل ہو گئے ہوں۔

عدالت نے سوال کیا "تُو کون ہے؟"

"مُلزم کی بیوی"۔

عدالت نے چند لمحہ سکوت کیا اور تب ۔

کورٹ انسپکٹر سے کہا "گرفتار کر لو۔ مقدّمہ نیا رنگ اختیار کرنے کو ہے"۔

یہ گرفتاری دیوکی کی موت کا پیش خیمہ تھی۔ مگر دیوکی کو اسکی پروا نہ تھی۔ بلکہ وہ اِسوقت ایسی خوش تھی۔ جیسے کسی افلاس زدہ کو معاً دفینہ مل گیا ہو یہ خوشی اُس کے چہرے سے، آنکھوں سے،

اور حرکات سے ظاہر تھی ۔

(۱۴)

اے بھائی! دیوکی نے اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں دے کر اپنے خاوند کو چُھڑا لیا۔ مگر اِس سے روپ چند خوش نہیں ہوئے۔ وہ اب ہر وقت مغموم رہتے تھے۔ وکیل وعدہ معشوق کے مانند پیشیاں بُھگتنے لگے۔ عدالتی کارروائی پھر سے شروع ہوئی۔ روپ چند چاہتے تھے۔ جس طرح بھی ہو سکے۔ دیوکی کو چُھڑا لیں مگر یہ آسان نہ تھا۔ دیوکی نے خود اقبال جُرم کر لیا تھا۔ اُس نے جو بیان دیا۔ اُس میں صاف صاف کہدیا۔ کہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ میرا خاوند مجھ سے روٹھ کر یہاں چلا آیا تھا۔ میں اُس کی جُدائی برداشت نہ کر سکی۔ یہاں چلی آئی۔ مگر خاوند کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔ دلوں میں فرق آگیا تھا۔ یہاں آکر مجھے شُبہ ہُوا۔ کہ لوسی کو میرے شوہر سے محبّت ہے۔ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں اپنی زندگی دے سکتی تھی۔ مگر شوہر اور شوہر کی محبّت نہ دے سکتی تھی۔ مجھے زہر چڑھ گیا۔ دل و دماغ دونو کھولنے لگے میں نے اُسے ایک دو دفعہ سمجھایا۔ مگر اُس نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔ بولی۔ میں اِس محبّت سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ مجھ پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا۔ میں اپنے شوہر کے جھونپڑے میں گئی کہ اُنہیں اُس عورت اور اُس کے چلن سے

آگاہ کر دوں۔ مگر وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہوں۔ کہ وہاں تُو سی بیٹھی ہے۔ میری دیوانگی میں اور اضافہ ہُوا۔ میں نے اک جوش کی حالت میں میز سے چُھری اُٹھا لی۔ اور اُس پر حملہ کیا۔ چُھری سینے میں اُتر گئی۔ اب میری آنکھیں کُھلیں۔ خیال آیا۔ میں نے کیا کر دیا۔ مگر سوچنے کا وقت نہ تھا۔ مَیں جلدی سے باہر آ گئی۔

دیوکی کے اِس بیان سے عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں کانا پُھسکیاں ہونے لگیں۔ بعض لوگ کہتے تھے۔ یہ بیان حرف بحرف سچ ہے۔ اِس عورت نے اپنی لاج رکھ لی ہے۔ بعض کہتے تھے۔ ہندوستانی عورت نے اپنی جان دے کر شوہر کو چُھڑا لیا ہے۔ ورنہ قتل کا الزام اِس سے کوسوں دُور ہے۔ روپ چند کھڑے دیکھتے تھے اور خاموش تھے۔ واقعات نے اُن کی قوّت گویائی سلب کر لی تھی جس طرح سُورج کی گرمی سے تالاب کا پانی خشک ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی تہہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اُسی طرح ہجومِ یاس نے روپ چند کے دل کا اطمینان اُڑا دیا تھا۔ اُنکا وہ غصّہ قائم نہ رہا تھا۔ دیوکی کے لئے ہر دم روتے رہتے تھے۔ دل کی تہہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی طرف سے انتہائی کوششیں صرف کر رہے تھے مگر اُن کے کئے کچھ بنتا نظر نہ آتا تھا۔ کیا حسرت آفرین واقعہ تھا۔ کہ بیوی مَوت کے کُھلے مُنہ میں جا رہی تھی اور خاوند سامنے کھڑا مُنہ تکتا تھا۔ مگر کچھ کر نہ سکتا تھا۔

ایک دن مَیں بہت رات گئے ہوٹل گیا۔ قریباً سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جاکر سو چکے تھے۔ مَیں نے کپڑے اُتارے۔ اور لیٹ گیا۔ مگر آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ رہ رہ کر سوچتا تھا۔ کیا سچ مچ دیوکی کو پھانسی پر چڑھنا ہوگا۔ اِس خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ آنکھوں میں پانی آجاتا تھا۔ معاً ساتھ کے کمرے سے کچھ بات چیت کی آواز آئی۔ مَیں نے دیوار کے ساتھ کان لگا دئے۔ معلوم ہُوا۔ ایک مرد اور عورت باتیں کر رہے ہیں +

مرد نے پُوچھا۔ تو اب تمہارا ارادہ ہے کہ نہیں۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہدو۔ مجھے زیادہ وعدوں پہ نہ رکھّو۔ مَیں چاہتا ہوں۔ جتنی جلد ہو سکے۔ شادی ہو جائے +

عورت۔ تم ذرا صبر کیوں نہیں کرتے۔ میری بہن کو مرے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ شادی ہوتے دیکھ کر لوگ کیا کہینگے۔ آوازے کسنے لگیں گے۔ شہر میں بسنا مشکل ہو جائیگا +

مرد۔ لوگوں کی پروا نہ کرو +

عورت۔ پروا کیسے نہ کروں۔ آخر اِسی شہر میں رہنا ہوگا +

مرد۔ بہن کی موت کا بڑا ملال ہے کیا؟

عورت۔ تم مرد ہو۔ مردوں کے دل سخت ہوتے ہیں۔ مگر مَیں تو عورت ہوں۔ اتنی سنگدل کیسے ہو جاؤں؟

مرد۔ ... طرح قتل کیا تھا +

عورت۔ چُپ۔ کوئی سُن لیگا +

مرد۔ ہندوستانی عورت قربان ہو رہی ہے۔ بعض وقت میرا دل کانپ جاتا ہے +

اندہیرے میں شعاعِ اُمید چمک گئی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اِسوقت میں ایسا خوش تھا۔ کہ زمین آسمان کی سُدھ نہ تھی۔ بھاگا بھاگا پولیس کے دفتر میں جا پہنچا۔ دوسرے دن اصلی قاتلہ عدالت میں پیش ہوئی۔ مقدمہ کا رنگ بدل گیا۔ یہ عورت مقتول لڑکی کی بہن تھی۔ اوّل اوّل اُس نے اپنے بچاؤ کی بہت کوشش کی۔ مگر آخر پولیس اور عدالت کے ہتھکنڈوں میں آگئی۔ قانون کے آہنی پنجے نے اُسے بھاگنے کی مہلت نہ دی۔ اُس نے اپنے بیان میں اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ کہا۔ کہ وہ دونو بہنیں روپ چند کو چاہتی تھیں۔ اوّل اوّل مُلزمہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کی بہن کو بھی اُس سے عشق ہے۔ کچھ دیر بعد جب یہ راز اُس پر ظاہر ہُوا تو وہ بپھری ہُوئی شیرنی کی طرح غُصّہ میں بھر گئی۔ اور چھوٹی بہن سے بولی۔ تُو اُس ہندوستانی پادری کا خیال چھوڑ دے۔ ورنہ میں تیری بوٹیاں نوچ لونگی۔ مگر لوسی پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ جس طرح تپے ہوئے توے پر پانی کی بُوند کا اثر نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ ایک دن موقعہ پاکر اُس نے اُسے اُس ہندوستانی کے جھونپڑے میں قتل

کر دیا"۔

دیو کی رہا ہو گئی۔ اب اُس عورت پر مقدّمہ چلنے لگا۔

مَیں نے ایک دن اُس سے مُلاقات کی اجازت لے کر پُوچھا "کیا اجازت ہے مجھے ایک سوال پُوچھنا ہے"۔

"کیا مقدّمہ کے متعلّق؟"

"نہیں اُس کا مقدّمہ سے کچھ ایسا تعلّق نہیں"۔

"پوچھئے"۔

"تُم دونو بہنوں کو اُس ہندوستانی سنیاسی کا خیال تھا۔ کیا وہ سنیاسی بھی تُم میں سے کسی ایک پر فریفتہ تھا؟"

معلوم ہوتا ہے۔ اِس سوال سے اُس کے زخم دل ہرے ہو گئے۔ سر جُھکا کر بولی "بالکل نہیں۔ وہ ہم دونو میں سے کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اپنی بہن کو اُس کے جھونپڑے میں جا کر اُس کی چُھری سے قتل کیا۔ تا کہ ایک ہی وار سے دونو دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر قسمت میں یہ بدا ہے یہ علم نہ تھا"۔

اے بھائی! میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے کسی کا بُخار اُتر جائے۔ مَیں روپ چند کے جھونپڑے میں پُہنچا۔ وہاں روپ چند میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے اپنے بازو پھیلا دئے۔ یہ بازو میرے لئے بہشت کے دروازوں سے کم نہ

تھے۔ مجھ پر کیف کا عالم طاری ہوگیا۔ مَیں سمجھتا تھا انسانی جنم لینا آج مُبارک ہُوا۔ چاروں طرف اُچھلتا پھرتا تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا۔ کہ کوئی دیکھے گا۔ تو کیا کہیگا۔ مَیں اپنی دیوانگی کا خود اظہار کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آرام سے بیٹھے۔ تو مَیں نے کہا "آپ نے ہم لوگوں کا تو خیال ہی چھوڑ دیا۔ صُورت دیکھنے کو جی ترس جاتا ہے"۔

روپ چند نے آسمان کی طرف دیکھ کر آہ سرد بھری اور جواب دیا "بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو یہ جھونپڑا دل میں بس گیا"۔

"تو کیا آپ واپس نہ چلیں گے؟"

"ارادہ تو ایسا ہی ہے"۔

"اور غریب دیوکی کا کیا بنے گا؟"

"اُس کا میرے روبرو نام نہ لو"۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اُس کا نام سُن کر میرا دل جلنے لگتا ہے۔ اُس نے اپنی مرجاوا پر پانی پھیر دیا"۔

مَیں نے جوش سے کہا "آپ کو بچانے کے لئے اُس نے آپ کو موت کے مُنہ میں ڈال دیا تھا"۔

"یہ سب سچ ہے۔ پر گناہ کا داغ خون سے بھی نہیں مٹتا"۔

"تو آپ کے دل میں گرہ بندھ گئی"

"اور ایسی جو کبھی نہ کھُلے گی۔ تم اب اِس مضمون پر زیادہ گفتگو نہ کرو۔ مجھے اِس سے روحانی صدمہ ہوتا ہے"

"مگر دیو کی بیگناہ ہے"

روپ چند نے جواب نہ دیا۔ بظاہر اِس بات سے اُن کے دل پر چنداں اثر نہ ہُوا۔ مگر مَیں نے سارا واقعہ اُن کے سامنے رکھدیا اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ تب اُن کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے۔ حبس کے بعد بارش ہوئی۔ روتے روتے بولے "ہری سین! میں نے اُس پر ظُلم کیا ہے۔ وہ دو تین دفعہ یہاں آئی تھی۔ مگر میں نے جھڑک دیا۔ پتہ نہیں۔ اُسوقت کیا کہتی ہوگی۔ اب میرے دل میں اُس کی طرف سے کوئی غُبار نہیں۔ مَیں اُسے مُجرم سمجھتا تھا۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ قصور میرا ہی ہے۔ چلو! مَیں اُس سے معافی مانگونگا"

ہم دونو چلنے کو تیار ہوئے۔ اتنے میں دیو کی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا آگیا۔ وہ ایسی نحیف و نزار ہوگئی تھی۔ جیسے موسم خزاں میں پھُول کی ٹہنی مرجھا جاتی ہے۔ روپ چند نے اُسے دیکھتے ہی باہیں پھیلادیں دیو کی جوش مسرّت سے آگے بڑھی۔ مگر قدموں میں گر کر بیہوش ہوگئی۔

پنڈت جی نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اور رونے لگے۔ یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

اُس رات روپ چند کے جھونپڑے "کنجِ عافیت" کا اور ہی عالم تھا۔ چاروں طرف مسرت کھیلتی پھرتی تھی۔ ہم سب کو گویا ہُوا قرار مل گیا تھا۔ مَیں وہاں کچھ دن ٹھہرا۔ اُن دنوں کی یاد اب بھی سینہ میں ہلچل مچا دیتی ہے۔ اے بھائی! میں نے کئی شہر دیکھے ہیں۔ اور کئی شہر دیکھونگا۔ مگر جو لطف، جو رنگینیاں جو روحانی مناظر اُس جھونپڑے "کنجِ عافیت" میں تھے۔ وہ نہ کہیں اور ملے ہیں نہ ملینگے۔ وہاں پریم کی ہوا بہتی تھی۔ عشق کے پھُول کھلتے تھے۔ دیوکی اور روپ چند کے پاکیزہ خیالات نے میرے مغربی دل کو تبدیل کر دیا۔ اب وہ وہاں نہیں۔ ہندوستان چلے گئے ہیں۔ اور کشمیر میں چشمہ ویری ناگ کے کنارے رہتے ہیں وہاں بھی اُنھوں نے ایک جھونپڑا بنا لیا ہے۔ اور اُس کا نام بھی "کنجِ عافیت" ہی رکھا ہے۔ میرے ہندوستان جانے کا باعث وہی جھونپڑا ہے۔ مَیں اُس کے مناظر دیکھنے کے لئے اِس طرح تڑپ رہا ہوں۔ جس طرح مچھلی پانی کے لئے تڑپتی ہے۔ مَیں نے اپنا جنم بھوم آجتک نہیں دیکھا۔ مَیں سمجھتا ہوں۔ وہ سرزمین بڑی دلفریب، بڑی پاکیزہ بڑی خوبصورت، سرسبز و شاداب ہوگی۔ مگر جب مَیں ان تمام صفات کو یکجا جمع کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے

گنجِ عافیت کا نقشہ آجاتا ہے میرا تخیل اِس سے پرے نہیں جا سکتا"۔

(۱۵)

یہ کہتے کہتے ہری سین نے سر جھکا لیا۔ ایک اجنبی کے دل میں حُبّ وطن کا جذبہ کس طرح بیدار ہوتا ہے۔ یہ مجھے پہلی دفعہ علم ہُوا۔ باہر نیلگوں کھلا سمندر گرج رہا تھا۔ اندر میرے دل میں ہزاروں خیالات لہریں مار رہے تھے۔ ان خیالات نے میری زبان بند کر دی۔ مَیں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اسکے بعد سر اُٹھا کر ہری سین کی طرف دیکھا۔ اِسوقت وہ مجھ سے کتنا نزدیک، کتنا اپنے قریب دکھائی دیتا تھا۔ مَینے محبّت بھرے لہجہ میں کہا "ہری سین"!

ہری سین نے میری طرف آنکھیں اُٹھائیں۔ اُن میں پُتلیوں کے بجائے دل رکھا تھا۔ اُس نے مجھے ہموطن بھائی کہا۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

جہاز رات کی تاریکی میں تیزی سے چل رہا تھا۔ اور ہم لمحہ بہ لمحہ ساحل ہندوستان کے قریب پہنچ رہے تھے۔



ل عام پریس لاہور میں باہتمام ایم نظام اقبال مینیجر چھپی